سیلاب و گرداب

احمد ندیم قاسمی

مکتبۂ کارواں ۔ کچہری روڈ ۔ لاہور

سیلاب و گرداب

سیلاب و گرداب

(دو مجموعوں کے منتخب افسانے)

احمد ندیم قاسمی

مکتبہ کارواں، کچہری روڈ، لاہور

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ!

ناشر : چودھری عبدالحمید ایم اے
مطبع : اُردو پریس ہیکلوڈ روڈ، لاہور

[redacted]

[redacted]

شیخ خورشید احمد ایڈووکیٹ کے نام!

فہرست

nice اُلجھن	۱۱
nice بڈھا	۳۲
good کانی آنکھ	۴۹
من کی ڈالی	۶۷
نیم وا دریچے	۸۳
ایک رات چوپال پر	۱۰۹
ادھورا گیت	۱۲۳
حیوان اور انسان	۱۵۵
سونے کا ہار	۱۷۵
غریب کا تحفہ	۱۹۱
استغنا	۲۰۹

مختصراً

"سیلاب" اور "گرداب" میرے افسانوں کے دو الگ الگ مجموعے تھے۔
یہ افسانے ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء میں لکھے گئے۔ اور ۱۹۴۲ء میں دو مجموعوں
کی صورت میں ادارۂ اشاعتِ اردو (حیدرآباد۔ دکن) سے شائع کیے گئے۔ اس
وقت تک میرے افسانوں کے تین مجموعے "چوپال"، "بگولے" اور "طلوع و غروب"
لاہور سے شائع ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود میں اس دور کو اپنی افسانہ نویسی کا
ابتدائی دور ہی کہوں گا۔ ظاہر ہے کہ یہ ابتدائی دور زود نویسی کا دور بھی تھا۔ ان دونوں
مجموعوں میں ۲۷ افسانے اور دو ڈرامے شامل تھے۔ مجھے اعتراف ہے کہ ان
میں سے بیشتر خام تھے اور میں اپنی زندگی کے آغاز میں ہر نئے ادیب کی طرح
کڑے انتخاب کے بجائے فوری اشاعت کو ضروری سمجھتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کہانیاں
بھی جنھیں زیادہ سے زیادہ ایک نومشق کی کوشش کہا جا سکتا ہے، ان مجموعوں میں

شامل ہو گئیں۔ اب میں ان افسانوں کا انتخاب ایک ہی مجموعے کی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ میں نے وہ افسانے خارج کر دیئے ہیں جو کسی بھی صورت میں میری نمائندگی نہیں کرتے بلکہ محض لکھنے کی خاطر لکھے گئے تھے۔ یہ دس افسانے جو "سیلاب و گرداب" کی صورت میں یکجا شائع ہو رہے ہیں۔ میری ابتدائی ادبی زندگی کے صحیح نمائندہ ہیں۔ اس زمانے میں مجھے جو موضوعات پسند تھے اور میں جو ٹکنیک استعمال کرتا تھا یا میرا جو اسلوب صورت پذیر ہو رہا تھا، وہ ان افسانوں میں نمایاں ہے۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت وہ سادگی، معصومیت اور حیرت ہے، جنھیں بعد میں تجربات و مشاہدات نے بہت حد تک بدل ڈالا۔ میں یہ افسانے اطمینان اور مسرت سے دوبارہ پیش کر رہا ہوں۔

ندیم

فروری ۱۹۶۱ء

"سیلاب"

۲.

۴.

۱.

اُلجھن

برات آئی، دُعائے خیر کے لئے ہاتھ اُٹھائے گئے اور اُس کے بیاہ
کا اعلان کر دیا گیا ۔۔ وہ لال دوپٹے میں سمٹی ہوئی سوچنے لگی کہ اتنا بڑا
واقعہ اتنے مختصر وقت میں کیسے تکمیل تک پہنچا ۔ وہ تو یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ جب
برات آئے گی تو زمین اور آسمان کے درمیان الف لیلہ والی پریوں کے
غول ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، پروں سے پر ملائے، بڑا پیارا سا ناچ
ناچیں گے ۔ بکھرے ہوئے تارے ادھر اُدھر سے کھسک کر ایک دوسرے
سے چمٹ جائیں گے اور ٹمٹماتے ہوئے بادل کی شکل اختیار کر لیں گے۔
اور پھر یہ بادل ہولے ہولے زمین پر اُترے گا ۔ اس کے سر پہ آکر رُک
جائے گا اور اُس کے حنا آلود انگوٹھے کی پوروں کی لکیریں تک جھلملا اُٹھیں گی
دُنیا کے کناروں سے تہنیت کے غلغلے اُٹھیں گے اور اُس کے بالیوں بھرے
کانوں کے قریب آکر منڈلائیں گے ! ۔۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ یہ دن اور رات
کا سلسلہ صرف اس کے بیاہ کے انتظار میں ہے ۔ بس جونہی اس کا بیاہ ہوگا
پورب پچھم پر ایک نیا لا سا اُجالا چھا جائے گا جسے نہ دن کہا جا سکے گا اور
نہ رات ۔۔ بس جھٹپٹے کا سا سماں رہے گا قیامت تک ! اور پھر جونہی برات

اُس کے گھر کی دہلیز اُلانگے گی۔ یہ سارا انتظام کھنکھلا کر اُن دے گا اور تب سب لوگوں کو معلوم ہوگا کہ آج گوری کا بیاہ ہے۔

لیکن بس برات آئی۔ لمبی لمبی داڑھیوں والوں نے آنکھیں بند کرکے دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔ شکر اور تل تقسیم کئے گئے۔ اور پھر اُسے ڈولی میں دھکا دے دیا گیا۔ ڈھول چنگھاڑنے لگا ۔ شہنائیاں بلکنے لگیں گولے بھونکنے لگے۔ اور وہ کسی اَن دیکھے، اَن جانے گھر کو روانہ کر دی گئی!

ڈولی میں سے بہت مشکل سے ایک جھری بنا کر اس نے میراسیوں کی طرف دیکھا۔ کالے کلوٹے بھتنے! میلا ڈھول اور مری ہوئی سنپولیوں کی سی شہنائیاں! نہ بین نہ باجہ۔ نہ تو تلیاں۔ نہ اونٹوں کے گھٹنوں پر جھنجھناتے ہوئے گھنگرو۔ نہ گولے نہ پھُلجھڑیاں! ـــ جیسے کسی لاش کو قبرستان کی طرف لئے جا رہے ہیں:

ہاں! وہ لاش ہی تو تھی اور یہ ڈولی اس کا تابوت تھا۔ سفید کفن کے بجائے اس نے لال کفن اوڑھ رکھا تھا اور پھر یہ نتھ۔ بُلاق۔ جھومر۔ بار ـــ ہاں ـــ یہ قبر والے بچھو اور کنکھجورے تھے، جو اُسے قدم قدم پر ڈس رہے تھے۔

ڈولی کے قریب بار بار ایک بوڑھے کی کھانسی کی آواز آتی تھی۔

شاید وہ دُولھا میاں کا باپ تھا — اور پھر جب دُولھا کا باپ پل پل بھر بعد بلغم کے اتنے بڑے بڑے گولے پٹاخ سے زمین پہ دے مارتا ہے، وہ خود کیسا ہوگا! — ہائے ری!

وہ رو دی۔ وہ اس سے پیشتر بھی رونی تھی۔ جب اُس کی ماں نے اُسے گلے سے لگایا اور سرگوشی کی "میری لاڈلی گوری! تیری عزت ہماری عزت ہے۔ تو اب پرائے گھر جا رہی ہے۔ بڑے سلیقے سے رہنا ورنہ ناک کٹ جائے گی ہماری!" — یعنی اُس کی ماں کو اس موقعہ پہ بھی اپنی ناک ہی کی فکر کھائے جا رہی تھی — اور بیچاری گوری کا دل — جیسے دہکتی ہوئی بھٹی میں دانۂ اسپند ڈال دیا جائے! اُس کے دل کی ماں کو پروا ہی نہ تھی اُس وقت دکھا دینے کی خاطر وہ روئی بھی سسکیاں بھی بھریں۔ گھگھیا کے دو ہچکے۔ سہے، آنسو بھی پونچھے۔ پر اُس رونے میں کوئی مزا نہ تھا۔ یہاں ڈولی میں آ کر جو آنکھوں میں نمی تیرتی رہی تھی کہ اس کے روئیں روئیں میں ہزار دل خفقہ بیقرار ہل جاگ اٹھیں — شہنائیاں اس کا ساتھ دیتی ہیں ڈھول بجتا رہا۔ جب ڈولی دُولھا کے گھر تک پہنچی تو ایک گولہ چھوٹا جیسے کسی بیمار کو مری مری چھینک آئے! اُسے اپنی سہیلی نورتی پہ بہت غصّہ آیا۔ جو بیاہ کے گیت گانے میں تاک سمجھی جاتی تھی اور جس نے بیاہ... گوری کو چھیڑنے کے لئے گھر سے صبح میں ایک گیت گایا تھا —

عطر پھلیل لگا لے ری گوری

سیج بلاوے تو سئے!

گوری نے ڈولی سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ آنگن سے اُس پار تک نرم روئی کی ایک پگڈنڈی سی بچھا دی گئی۔ اُس کی ساس اُس سے یوں لپٹ گئی جیسے گوری نے شراب پی رکھی ہے اور ساس کو اُس کے لڑکھڑا جانے کا خوف دامن گیر ہے۔ گوری نرم نرم روئی پر چلی۔ تو اُسے یونہی ایک زنک سا گزرا کہ واقعی یہ واقعہ تھا تو بڑا۔ اس کا اپنا اندازہ غلط تھا۔ آخر اتنی ملائم روئی صرف اسی لیے تو خاک پر بچھائی گئی ہے کہ اُس کے مہندی رچے پاؤں میلے نہ ہوں! پر جونہی اس نے اس شبہ کو یقین میں بدلنا چاہا تو اچانک اُس کے پاؤں زمین کی سخت ٹھنڈی سطح سے مس ہوئے اور سراب کی چمک ماند پڑ گئی! — روئی ختم ہو چکی تھی۔

اب اُسے ایک سخت سزا بھگتنا پڑ گئی۔ اُسے ایک کونے میں بٹھا دیا گیا۔ اس حالت میں کہ اُس کا ۔ جھک کر اُس کے گھٹنوں کو چھو رہا تھا اور اُس کے گلے کا ہار آگے لٹک کر اُس کی ٹھوڑی سے لپٹا پڑتا تھا۔ گاؤں والیاں آنے لگیں۔ الٹی جوتی اس کے مُردہ ہاتھ میں ٹھونس دی اور گھونگھٹ اُٹھا اُٹھا کر بہر بہر اُس کے چہرے کو گھورا جانے لگا — جیسے لاش کے چہرے سے آخری دیدار کی خاطر کفن سرکا دیا جاتا ہے!

سارا دن اُس کی ناک کے بانسے، اُس کی پلکوں کے تناؤ، اُس کے ہونٹوں کے خم، اُس کے نام اور اُس کے رنگ، اُس کی اتنی بڑی نتھ اور جھومر اور بالیوں کے متعلق تذکرے کئے گئے اور جب سورج پچھم کی طرف لٹک گیا تو اس کے آگے چُوری کا ایک کٹورا دھر دیا گیا۔ اُس کی ساس ناک سڑسڑاتی اُس کے پاس آئی اور بولی "لے میری رانی کھا لے چُوری!" — جیسے نئے نئے طوطے کو پچکارا جاتا ہے۔ اُسے ایک بار خیال جی آیا کہ کیوں نہ نئے طوطے کی طرح لپک کے اُس کی ناک کاٹ لے۔ مگر اب اُس نے ایک اور موضوع پر بولنا شروع کر دیا تھا "کیا کروں بہن عجب مصیبت ہے۔ جی میں آتی ہے۔ نگوڑی ناک کو کاٹ کر وہ پھینکوں۔ بہی چلی جا رہی ہے۔ اتنی چھینکیں آتی ہیں بہن اور اتنی بڑی چھینکیں کہ اللہ قسم، انتڑیاں کھنچ جاتی ہیں۔ اِدھر میرے لال کا بھی یہی حال ہے۔ پڑا چھینکتا ہے پلنگ پر۔ اور اُس کا باپ تو کھانس کھانس کر اَدھ مُوا ہو رہا ہے!"

•

گوری کا جی متلا گیا!

پرے کونے میں دبکی ہوئی ایک بڑھیا نے اپنے زکام کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ "چھینک آتی ہے اور نہیں بھی۔ بس یوں مُنہ کھولتی ہوں، کھولے رکھتی ہوں۔ اور چھینک پلٹ جاتی ہے اور پھر دماغ میں وہ کھلبل مچتی ہے بہن — وہ کھلبلی مچتی ہے کہ جی چاہتی ہوں چولھے میں دے دوں اپنا سر!"

"عام شکایت ہے۔" دوسری بولی۔

پہلی نے اپنی بینگن ایسی ناک کو چادر تلے چھپا کر کہا "پر میں تو سمجھتی ہوں یہ آفت صرف مجھی پر ٹوٹی۔ اوروں کو زکام ہوتا ہے۔ دماغ میں کھلبلی ہوئی، چھینک آئی اور جی خوش ہو گیا۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ زکام کی فکر الگ اور چھینک کی الگ!"

اور خدا جانے کیا بات ہوئی کہ گوری کو بھی چھینک آگئی۔ اُس کی ساس کے تو اوسان خطا ہو گئے: "تجھے بھی چھینک آگئی بیٹا! اے ہے۔ اب کیا ہو گا۔ نئی نویلی دُلہن کو اللہ کرے کبھی چھینک نہ آئے۔ بنفشے کا کاڑھا بنا لاؤں؟ پر اس صدی میں تو بنفشے کا اثر ہی ختم ہو گیا۔ گرم گرم چنے ٹھیک رہیں گے۔" وہ یہ کہہ کر تیزی سے اُٹھی تو چادر پاؤں میں اُلجھ گئی، بڑبڑا کر پرے کرنے والی بڑھیا پہ جا گری وہ بے چاری چھینک کو دماغ سے نوچ پھینکنے کی کوشش میں تھی۔ یہ نئی آفت ٹوٹی تو اُس کے مُنہ سے کچھ ایسی آواز نکلی جیسے گیلا گولا پھٹتا ہے!

ہڑبونگ مچی تو گوری سب کے دماغوں سے اُتر گئی اور جب کچھ سکون ہوا تو بوڑھی نائن گُھٹنوں پہ ہاتھ رکھے اندر آئی اور گوری کے پاس بیٹھ کر بولی "اے ہے میری رانی۔ ابھی تک چُوری نہیں کھائی تو نے؟ نوج ایسی لاج بھی کیا! جانے ان دلہنوں کو کیا ہو جاتا ہے۔ دو دو دن تک ایک کھیل

بھی اُڑ کر نہیں جاتی پیٹ میں اور مُنہ مچوڑے بیٹھی ہیں۔"

"جی نہیں چاہتا۔"

"جی چاہتا تو ہے اندر سے' پہ یہ نگوڑی لاج! نیا گھر — نئے لوگ — پر گوری رانی۔ میں تو تیری وہی پُرانی نائن ہوں۔ جلنے کے بار میڈھیاں بنائیں۔ کے بار کنگھی کی۔ وہ ایک بار تیرا بُندا اٹک گیا تھا بالوں میں۔ تو چلائی تو گھر بھر میں چل اُٹھا۔ بڑی بوڑھیوں کا جمگھٹ ہو گیا۔ کوئی بُندے کو مروڑ رہی ہے۔ کوئی بالوں کی لٹیں کھینچ رہی ہے اور تو گلاب کا پھول بنی جا رہی ہے دُکھ سے میں آئی۔ بالوں کی ایک لٹ کو ادھر اُٹھایا۔ ایک لٹ کو ادھر کھسکایا اور بُندا اپنی جگہ پر آ گیا۔ یاد ہے نا؟ — پر تو چُوری کیوں نہیں کھاتی؟ یہ بھی کوئی بات ہے!" — اور نائن نے گوری کا گھونگھٹ اُٹھا کر کٹورا آگے بڑھا دیا۔

•

گوری کو تو جیسے آگ لگ گئی۔ چُوری کھائے تو ہیٹی ہو۔ سب کہیں چار دن سے بھُوکی تھی۔ بھُوکے گھر سے آئی ہے! — اور اگر ہاتھ اٹھا کر کٹورے کو پرے دھکیلتی ہے۔ تو چوڑیاں بجتی ہیں۔ یہ کم بخت بلور کی چوڑیاں جن کے چھناکے میں چھریاں تیز کئے جانے کی آواز تھی۔ بڑی بوڑھیاں کہنیوں تک ٹھونس دیتی ہیں چوڑیاں اور پھر ساتھ ہی یہ بھی کہتی ہیں کہ آواز نہ آئے ذرا کی۔ لوگ بے شرم کہیں گے!

گوری پہلے تو بُت بنی بیٹھی رہی۔ لیکن جب نائن نے کٹورا اتنا آگے بڑھا دیا
کہ وہ اس کے چولے کو چھونے لگا تو وہ ضبط نہ کر سکی۔ سرگوشی سے بھی کہیں
مدھم آواز میں بولی: "میں نہیں کھاؤں گی۔"

"کیوں نہیں کھائے گی؟" نائن نے اب گوری کا گھونگھٹ اٹھا کر اپنے
سر پہ ڈال لیا تھا۔ "کیوں نہیں کھائے گی؟ میں کھلا کے چھوڑوں گی تو نہیں
کھائے گی۔ تو میں بھی نہیں کھاؤں گی۔ ہاں! — یہ تُو تو ضرور کھائے گی۔
یہ دیکھ میں کھا رہی ہوں۔ دیکھ نا گوری دُلہن!" — اس نے چوری کی مٹھی بھری
اور پوپلے مُنہ میں ٹھونس کر بولی: "اب کھا بھی لے گوری رانی۔"

"میں نہیں کھاؤں گی!" گوری نے یہ الفاظ کچھ اونچی آواز میں کہے اور
گھونگھٹ کھینچ کر دیوار سے لگ گئی۔ چوڑیاں بجیں تو عورتیں منمنانے لگیں۔

"نئی نویلی دُلہنوں کو پہلے دن کبھی بولتے نہ سُنا۔"

"اور پھر ایک جگہ جم کر بیٹھتی ہی نہیں۔ تڑپ رہی ہے پارے
کی طرح۔"

"اس صدی میں بیاہ کیا ہوتے ہیں مداری کھیل دکھاتا ہے!"

"ہم نے دیکھی ہیں دُلہنیں۔ ایک ایک مہینہ نہیں بولیں کسی سے
— ایک ایک مہینہ!"

"مجھے تو اور کسی کی بات یاد نہیں، یہ سامنے نائن بیٹھی ہے ہماری۔

دس دن تک مُنہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھی رہی۔ گیارھویں دن زبان بھی ہلائی۔ تو بس اذان سے بعد کلمہ پڑھنے کے لئے!"

نائن یُوں ہنسنے لگی، جیسے ٹین کے ڈبّے میں کنکر ڈال کر اُسے لڑھکا دیا جائے! بولی: "کسی سے غلط بات سُنی تُو نے۔ میں نے تو نئے گھر میں قدم دھرا اور ساس نے سہارا دیا تو بلبلا اُٹھی تھی: "کیا لپٹی پڑتی ہے مجھ سے! میں کوئی لنڈوری چڑیا تھوڑی ہوں کہ اُڑ جاؤں گی پُھر سے! یہیں رہنے آئی ہوں، یہیں رہوں گی!" ساس اپنا سا مُنہ لے کر رہ گئی۔ اور میں نے اسی روز دن ڈھلے سہیلیوں سے گیٹیاں کھیلی۔"

"کون گیٹیاں کھیلی؟" گوری کی ساس دامن میں چنے ڈالے اندر آئی۔ "دلہنوں کے سامنے گیٹیوں کی باتیں کی جاتی ہیں؟ اتنی عمر گزر گئی سینکڑوں بار دایہ بنی پر بات کرنے کا ڈھب نہ آیا تجھے۔"

بھُونے ہوئے چنوں کی خوشبو سے کمرہ مہک گیا۔ لیکن شادی کے روز سسرال میں پہلے پہل چنوں سے فاقہ توڑنا بُرا شگون تھا۔ اس لئے گوری اپنے آپ کو اس نئے حملے سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ نائن کا بازو چھُوا۔ اور جب وہ اُس کے بالکل قریب ہو گئی تو آہستہ سے بولی: "مجھے نیند آئی ہے۔"

گوری کی ساس نے نائن سے پُوچھا: "کیا کہتی ہے دُلھن؟"

نائن ناک پر انگلی رکھ کر بولی "کہتی ہے مجھے نیند آئی ہے ——"
اور پھر ٹین کے ڈبے میں کنکر بجنے لگے "میری رانی! نیند کی بھی ایک ہی کہی تو نے۔ نیری نیند — دلہن کی نیند — اب میں کیا کہوں؟ گلے میں پھندا پڑ رہا ہے۔"

یہاں گوری کی ساس نے رحمت کے فرشتے کا روپ دھار لیا۔ بولی "اے رہنے بھی دے، بات بات پر دانت نکال رہی ہے۔ نائن ہو تو سلیقے والی ہو۔ یہ بھی کیا کہ ادھر بات ہوئی۔ ادھر منہ پھاڑ کر حلق کا کوا دکھا دیا۔ اتنا نہیں سوچا تو نے کہ دن بھر کی تھکن ہے —— سو جا میری گوری رانی! —— پر یہ چھنے!"

"اونہک" گوری ایک طرف جھک گئی اور قریب ہی بیٹھی ہوئی ادھیڑ عمر کی ایک عورت گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولی "بڑی لاڈلی دلہن ہے۔"

سب عورتیں باہر نکل گئیں مگر گوری کی آنکھوں میں نیند کہاں! آج تو نیند کی جگہ کاجل نے لی تھی۔ آنکھیں جھپکاتی رہی اور سوچتی رہی "واہ رے میرے پھوٹے بھاگ۔ یہی بیاہ ہے تو واری جاؤں کنوارپنے کے۔ کیا زمانہ تھا! کون سی بات یاد کروں۔ کس کس کو یاد کروں۔ وہ ساون کی چھم چھم میں گبرطے نیم کے ٹہنے میں جھولا۔ جھولا آگے لپکتا ہے تو ٹھنڈی پھوار منہ دھو ڈالتی ہے۔ جھولا پیچھے ہٹتا ہے تو خوشبو میں بسی ہوئی لٹیں چہرے کو

پونچھ ڈالتی ہیں۔ آس پاس سہیلیوں کا جھرمٹ۔ بھیگی بھیگی ڈھولک کی میٹھی میٹھی آواز اور وہ نوری کا رس بھرا گیت ؎

موہے ساون کی رم جھم بھائے رے!
بھیّا کے کان میں سونے کی مُرکی!
پھول پہ تتلی آئے رے!
موہے ساون کی رم جھم بھائے رے!

اور پھر اُسی شریر نوری کے کھلے آنگن میں چرخوں کی گھوں گھوں۔ گورے گورے ہاتھ پونیاں تھامے اُوپر اُبھرتے ہیں۔ تکلے سے باریک تار لپٹ کر ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے تار پونی سے نہیں نکلا۔ گوری ہتھیلی سے نکلا ہے! اور پھر وہ عید کے دن ملنگ سائیں کا میلہ! وہ اُتری ڈھیریوں پر پُروا کے جھونکوں میں لچکتی ہوئی گھاس ــــ وہ گرجتے ہوئے دن اور چُپ چاپ راتیں!

اور یہ نئی زندگی! جینا اجیرن ہو رہا ہے۔ ہاتھوں کو تو بھیا اور لاڈلی ٹھہروں۔ اجنبی عورتوں کا ہجوم۔ کوئی کھانستی ہے، کوئی چھینکتی ہے، کوئی پڑوسن کا گلا کرتی ہے، کوئی میری لونگ کے کناروں کو بھدا بتاتی ہے۔ نہ ساون کی رم جھم کے گیت، نہ الف لیلہ کی کہانیاں نہ ہم سنوں کی چہلیں! اس سے تو یہی اچھا تھا کہ ماں باپ مجھے کسی کنویں میں دھکا دے دیتے۔ یہ سانسوں کی ڈوری ٹوٹ جاتی۔ چین آ جاتا۔ کیسے مذاق کرتی تھی مجھ سے نوری ”تو بیاہی جائے گی۔ دلھن

بنے گی۔ مہندی رچائے گی۔ دودھ پیئے گی۔ چوری کھائے گی اور نوری کو اپنے من سے نکال دے گی ——بے چاری بھولی نوری ۔ ناداں سہیلی۔ تجھے کیا معلوم کہ بیاہ کی رونق صرف دکھاوا ہے۔ پھوڑے کی طرح —— اوپر سے گلابی، اندر سے پیپ بھرا —— اُف!"

گوری گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ چوڑیاں بجیں تو ساس اندر دوڑی آئی۔ اُس کے بعد ایک عورت —— پھر دوسری —— پھر تیسری —— اور وہی دم گھونٹ دینے والی حرکتیں اور باتیں! گوری نے چاہا —— ناداں بچوں کی طرح مچل جائے۔ بلک بلک کر رونے لگے۔ بھاگ کر باہر آنگن میں لوٹنے لگے۔ زیور اتار پھینکے۔ کپڑوں کی دھجیاں اڑا دے اور آنکھوں پر دھول بھرے ہاتھ مل کر سسکیاں بھرے اور کہے "میں تم سب سے تھک گئی ہوں۔ تم الف لیلہ والی ڈائنیں ہو۔ تمہاری کھانسی کی ٹھن ٹھن، تمہارے قہقہوں کی کرختگی، بہت ڈراؤنی، بہت گھناؤنی ہے۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ میں ناچنا اور گانا چاہتی ہوں" —— تب گوری کے دل میں ایک خیال آیا "نہ ہوئی نوری اس وقت ورنہ یوں زور سے گلے لگاتی اُسے کہ کمبخت کی پسلیاں پٹاخے چھوڑنے لگتیں!"

وہ خدا جانے اور کیا سوچتی۔ مگر ساس اور نائن اور دوسری کم بختیں۔ پھر وہی گھسی پٹی باتیں کرنے لگیں "جہیز کی کیا پوچھتی ہو بہن۔ سارا گھر دے ڈالا گوری کو۔ ایسے ایسے کپڑے کہ دیکھے سے میلے ہوں۔ وہ وہ زیور کہ

آنکھیں چُندھیا جائیں۔ پلنگ کے پائے نہیں دیکھے تم نے؟ نیچے تیز شنگرفی اور اُوپر سے اتنے سفید جیسے چاند اتار کر جڑ دیئے ہیں۔ اصل میں میرا بیٹا ہے ہی قسمت والا!"

اور نائن بولی "کیا سجیلا گبرو ہے۔ آج نائی کہہ رہا تھا۔ میں کپڑے پہنانے لگا دُولہا کو، شانے پہ ہاتھ پھیرا تو جیسے فولاد ہے۔ اور چہرے پہ وہ نور کہ تارے بغلیں جھانکنے لگیں ـــ پر میں نے ابھی ابھی اُسے ڈیوڑھی میں کھڑے دیکھا۔ اس زکام کا بُرا ہو۔ پھُول سا چہرہ یوں ہو رہا تھا ـــ" اور نائن نے اپنی سفید چادر کا پلّو سب کے آگے پھیلا دیا!

گوری کے لئے یہ موضوع بھی دلچسپی سے خالی تھا۔ نائنیں جھوٹ بولتی ہیں اکثر۔ پر وہ سجیلا ہے بھی تو کیا! حالت تو یہ ہے کہ چار پہر سے اس کے گھر میں بیٹھی ہوں اور اُس نے شکل تک نہیں دکھائی۔ وہیں ڈیوڑھی میں پڑا چھینکتا ہے، بے ترس!

بڑی دیر کے بعد شام آئی۔ عورتیں چلی گئیں اور اُس نے پاؤں پھیلا کر بازو تانے، زیوروں سے لدے پھندے سر کو دھیرے سے جھٹکایا اور باہر دیکھا۔ اُس کی ساس اور نائن سامنے کے کمرے سے باہر آتی تھیں اور تیزی سے اندر گھس جاتی تھیں۔ مرجھائی ہُوئی باہوں میں تانبے کے کنگن اور پیتل کی چُوڑیاں جیسے کھانس رہی تھیں۔ جُوتیاں چرمر چرمر چیخ رہی تھیں اور وہ کلدار گڑیا

کی طرح مٹکتی پھر رہی تھیں۔

کچھ دیر کے بعد گاؤں والیاں گیت گانے اور سُننے آئیں تو اُن کے ہمراہ نُوری بھی آئی۔ گوری کے قریب بیٹھ گئی اور اس کے کان میں بولی "آج تو بات تک نہیں کرتی بہن!" اور پھر آنکھیں مٹکا کر گنگنانے لگی!

دلہن کا بولنا گناہ ہے، اور پھر گوری تو اُن اللہ والیوں کا ذکر بھی سُن چکی تھی۔ جنھوں نے ایک ایک مہینہ چُپ شاہ کا روزہ رکھا۔ اس لیے اُس نے بولنا تو مناسب نہ سمجھا۔ بس دھیرے سے نوری کے پہلو میں کہنی جڑ دی۔ اور نوری تڑپ کر بولی "تُنّے کے کلیجہ ہلا دیا میرا۔ کیوں نہ ہو، بیاہ جو ہو گیا تیرا۔ ہو لینے دے ہمارا بیاہ، تیرے گھر کے پاس سے گزریں گے تو ناک بھوں چڑھا کر آگے بڑھ جائیں گے غرور سے۔ پلٹ کر دیکھیں گے بھی نہیں۔ کر لے مان۔ گھڑی گھڑی کی بات ہے۔"

گوری کی زبان میں سوئیاں سی چُبھ گئیں۔ جب تک گیت گائے جاتے رہے وہ نوری کو اور نوری کے نقرئی بُندوں کو دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ "یہ کنوار پنے کے ساتھی بُندے کیسے بھلے لگتے ہیں گلابی کانوں میں۔ اور ایک میرے کان ہیں کہ کیڑوں ایسی پتلی پتلی بالیوں سے پٹے پڑے ہیں۔ نوری سر ہلاتی ہے۔ تو یہ بُندے تاروں کی طرح ٹمٹما اُٹھتے ہیں اور جب پلٹ کر ادھر اُدھر دیکھتی ہے تو بُندے انگوروں کا گچھا بن جاتے ہیں"۔۔۔ سوچتے سوچتے اُس کا ماتھا دھوپ

میں پڑی ہوئی ٹھیکری کی مانند تپ گیا اور جب سب ناچنے لگیں۔ اور
نوری نے ڈھولک کے ارد گرد گھوم کر ایک گیت گایا ؎

جا ری سہیلی اَب جا ۔۔۔ تو ہے پیا بُلا وے !
چاندی کی جھیلوں کے پار رے
سونے کے ٹیلوں کے پار رے
جا ری سہیلی اب جا ، ۔۔۔ تو ہے پیا بُلا وے !

تو گوری نے دیوار سے سر ٹیک کر رونا چاہا کہ ذرا جی ہلکا ہو جائے مگر
آج تو آنکھوں میں ہر چیز کی جگہ کاجل نے لے لی تھی۔ نہ نیندیں۔ نہ آنسو۔ بس
کاجل ہی کاجل ! ۔۔۔ اچھا بیاہ ہوا۔ یہ بھی خوب رہی !

جب سب چلی گئیں اور آنگن سُونا ہو گیا تو دُولھا کا باپ کھانستا ہوا آیا اور
ایک طرف سے حُقہ اٹھا کر چلتا بنا۔ نائن ہاتھ ملتی اُٹھی اور بولی "آ میری بچی۔ ادھر
پلنگ پر آ جا۔ نیند آ رہی ہو گی تجھے !" ۔۔۔ اور پھر گوری کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر
نائن نے اسے یُوں کھینچا جیسے لاش کو اُٹھا رہی ہے۔

گوری پاؤں گھسیٹتی کمرے میں آئی۔ رنگین پائے والے پلنگ پر دھم سے
گری اور چھم سے لیٹ گئی۔ نائن بولی " بیٹی یہ زیور تو اتار لے نہ جانے کہیں
اٹک گیا تو مشکل بنے گی۔"

"نہیں اٹکتا۔" گوری بولی " میں خود اتاروں گی کسی وقت۔"

نائن نے آگے بڑھ کر پھر اُس کی بغلوں میں دونوں ہاتھ جما دیئے "نہیں نہیں بیٹی۔ یہ بُرا شگون ہے۔ زیور اتارنے ہی پڑتے ہیں، ایک بار ایک دُلھن نے تیری طرح ..... "

لیکن نائن اپنی کہانی شروع کرنے ہی پائی تھی کہ گوری زیور نوچنے لگی اور پھر فوراً دھڑام سے پلنگ پر گر گئی۔ ٹین کے ڈبّے میں کنکر بج اُٹھے۔ نائن بولی "یہ بھی خوب رہی!" نائن چلی گئی اور گوری دانت پیس کر رہ گئی۔

جیسے بہت سے تاگے آپس میں اُلجھ جائیں تو اُنھیں سلجھانے کی کوشش اور اُلجھنیں پیدا کر دیتی ہے، بالکل یہی کیفیّت تھی گوری کے ذہن کی۔ بیاہ کا پہلا دن کابوس بن کر اُس کے سینے پر سوار تھا کہ اچانک چرّخ سے دروازہ کُھلا۔ گوری چونکی "اوے!"

"میں سمجھتی تھی نائن جھوٹ بکتی ہے۔" اُس نے گھونگھٹ کی شکنوں میں سے کنکھیوں سے نو وارد کو دیکھتے ہوئے سوچا "یہ میرا دولھا ہے یا لال بادشاہ!"

بھونچال سا آ گیا اُس کی طبیعت میں۔ چیختی ہوئی آندھیوں، کڑکتے ہوئے بادلوں، لُڑھکتی ہوئی چٹانوں اور ٹوٹتے ہوئے تھنوں میں لپٹا ہوا ذہن یہاں سے وہاں اُچھلنے لگا۔ سنبھل کر بیٹھنا چاہا تو پلنگ کے پلّے تک کھسک گئی۔

دُولہا مسکراتا رہا اور پھر پلنگ پر بیٹھ کر بولا "اگر تم کچھ اور پرے کھسکتیں تو پلنگ سے گر جاتیں!"

گوری خاموش رہی۔

دُولہا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا "سُنا کچھ!"

اور یکایک آندھیاں تھم گئیں اور بادلوں نے چُپ سادھ لی۔ گوری کے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ ذہن یوں صاف ہو گیا جیسے اُس نے کڑکتی دھوپ دوپہر میں لیموں کا یخ شربت غٹ غٹ چڑھا لیا ہے۔ انگڑائی آئی تو باہیں نہ تان سکی۔ بس اندر ہی اندر چٹخ پٹخ کر رہ گئی اور پھر ہاتھ چھڑا کر پرے کھسکنے کی کوشش کرنے لگی۔

"پلنگ سے گر جاؤ گی گوری" دُولہا بولا۔

"آپ کی بلا سے!" گوری نے جیسے اپنے ذہن کا سارا بوجھ اُتار کر پرے جھٹک دیا ہے!

"اگر تم گر گئیں تو مجھے تکلیف ہوگی۔" دُولہا بولا۔

گوری شرما گئی۔ بے تعلق سا سوال کر بیٹھی "زکام کا کیا حال ہے؟"

"رُک گیا ہے اس وقت" دُولہا مسکرایا اور پھر خاموشی کے ایک طویل وقفے میں گوری کی اُٹھتی اور گرتی ہوئی نظروں نے دولہا سے بہت سی باتیں کر لیں اور جب آنگن کے پرلے سرے پر اپنے دڑبے میں ایک مُرغی نیند میں

گنگنائی۔ تو دُولہا نے چونک کر کہا "کوئی بات کرو گوری۔"

"تم ہی کوئی بات کرو۔" گوری پہلی مرتبہ مسکرائی۔

"کیا بات کروں؟"

"کوئی کہانی وہانی سناؤ۔" گوری جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہے۔

"کہانی؟ — کیسی کہانی؟" دُولہا نے پُوچھا۔

"کوئی پریوں وریوں کی کہانی۔" گوری کھل کر بولنے کے باوجود سمٹی جا رہی تھی۔

"مجھے تو صرف لال بادشاہ اور سبز پری کی کہانی آتی ہے۔" دُولہا مُسکرایا۔

"وہی سہی۔" گوری نے انگلی میں سنہری انگوٹھی کو گھماتے ہوئے کہا۔

دُولہا نے تکیئے پر کہنی ٹیک دی "تو پھر ذرا سُنو۔ پر ذرا قریب ہو کر سُننا — یوں — جہاں زمین ختم ہو جاتی ہے نا، وہاں ایک نگری ہے جسے لوگ نیند نگری کہتے ہیں، اُس نگری پہ ایک بادشاہ راج کیا کرتا تھا۔ اُس کا نام تھا لال بادشاہ۔ بڑا خوبصورت، بڑا ہنس مکھ، بہت بانکا، بہت سجیلا —"

"تمہاری طرح۔" گوری بستر کی چادر پہ اُنگلی پھیرتے ہوئے یوں بولی جیسے کانسی کے کٹورے سے چھلا مس کر گیا ہو۔

دُولھا ہنس دیا اور گوری کی لال لال پوروں کو اپنی دُودھا یسی پوروں سے ٹٹول کر بولا: "تو کرتا خدا کا کیا ہوا گوری۔ کہ ایک دن لال بادشاہ شکار کھیلنے ایک جنگل میں جا نکلا اور . . . . . !"

ابھی کہانی نصف تک بھی نہیں پہنچی تھی۔ ابھی لال بادشاہ نے سبز پری کا ہاتھ اپنے ہاتھ ہی میں لیا تھا کہ دروازے کی جھریوں سے صبح کاذب جھانکی!

دُولھا چونک کر بولا: "ارے صبح ہو گئی!"

"نہیں شام ہو گی۔" گوری نے بھول پن سے کہا۔

اُچک کر دُولھا نے دروازہ کھولا۔ پلٹ کر مُسکرایا اور پھر باہر نکل گیا اور گوری نے اتنی لمبی انگڑائی لی۔ جیسے پورب میں انگڑائی لیتی ہوئی صبح کا مُنہ نوچ لے گی۔ تکیئے میں سر چھپا کر کہنے لگی: "ہائے ری نوری بہن۔ تو کتنی ابھاگن ہے پڑی ہو گی ٹوٹے کھٹولے پہ گٹھڑی بن کر — اور یہاں تیری گوری شنگرفی پایوں والے پلنگ پر۔ مہندی کی خوشبو سے بسے ہوئے کمرے میں — اپنے بانکے سجیلے دُولھا سے — اُف، کتنی سچی باتیں کہتی تھی تُو — ؟"

اُس نے مُسکرا کر دیئے کی پیلی روشنی میں اپنی لال ہتھیلیاں دیکھیں اور اپنے تپتے ہوئے چہرے پر ہاتھ مل کر بولی: "کاش اِس وقت یہاں نُوری ہوتی — یا کوئی آئینہ ہی ہوتا!"

بڈھا

جب منڈیروں پر پھدکتی ہوئی چڑیاں ایک دم پھر سے فضا میں اُبھر جاتیں اور کھُرلیوں کے قریب گٹھڑیاں بنے ہوئے بچھڑے اپنے لمبے لمبے کانوں کے آخری سرے ملا کر محرابیں سی بنا لیتے تو جھکی ہوئی دیواروں کے سائے میں بیٹھے ہوئے کسان مسکراتے اور خشک تمباکو کو ہتھیلیوں میں ملتے یا کھیس کے دھاگوں میں بل ڈالتے ہوئے کہتے "بابا عمرو کھانستا ہے!"

بابا عمرو کی کھانسی بہت گونجیلی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ملبے سے اَٹے ہوئے کنوئیں میں یکبارگی چند پتھر گر پڑے ہیں — وہ اپنے جھونپڑے کی چوکھٹ پر بیٹھا بکریوں کے بال بٹتا رہتا اور جب کھانستا تو پسلیوں کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیتا۔ اس زور سے تھوکتا کہ اُس کی مونچھوں کے جھکے ہوئے بال ستار کے تنے ہوئے تار بن جاتے۔ خربوزے کے مرجھائے ہوئے چھلکوں سے گالوں پر جھریوں کا جال سا تن جاتا اور جھکی ہوئی بھوسلی بھوؤں کے نیچے سے ندی کنارے کے گول کنکروں کی سی آنکھوں پر پانی کی پتلی سی لہر تیر جاتی۔ پڑوسن کے بچے تالیاں بجاتے اور چلّاتے "بابا عمرو کھانستا ہے!" — بابا عمرو کے کانوں میں ان چیخوں کی بھنک پڑ جاتی تو بکریوں کے بالوں کے گولے پر

بیتابانہ انگلیاں پھیرتا۔ رسی میں اتنے بل ڈالتا کہ وہ تن کر ٹیڑھی ہو جاتی اور پھر پاس ہی بیٹھی ہوئی بلی کو گردن سے پکڑ کر اپنی جھولی میں بٹھا لیتا اور کہتا "بابا عمرو کیا کھانسا۔ مداری نے پٹارے سے ڈھکنا ہٹا دیا۔ چھچھوندر کہیں کے! دیکھو لگ میری عمر کو پہنچ کر تم کیسے نہیں کھانستے۔ میں بھی تو جب جوانی میں کھانستا تھا تو ایسا لگتا تھا جیسے کوئی طبلہ بجا رہا ہے!"

اچانک پڑوس کی ایک لڑکی لپک کر گھر سے نکلتی اور جب بابا عمرو کو اپنے آپ سے سرگوشیاں کرتے دیکھتی تو آگے بڑھ کر کہتی "بابا عمرو میں آگئی۔"

بابا عمرو چونک اٹھتا۔ اور پھر اس کے لبوں پر ایسی جناتی مسکراہٹ نمودار ہونے لگتی جیسے ٹوٹے پھوٹے قبرستان میں چاندنی! کہتا "میں جانتا تھا میری ولیتو آئے گی۔ تو اتنی دیر تک کیا کرتی رہی ولیتو بیٹا؟"

"ہمارے گھر چاول پکے ہیں۔" ننھی ولیتو تالی بجا کر کہتی "میٹھے چاول لے آؤں تمہارے لئے؟ ہیں بابا عمرو؟"

"چاول قابض ہوتے ہیں۔" وہ ہونٹ سکیڑ کر کہتا اور جب لڑکی کے صاف چہرے پر انکار کے صدمے کا احساس شفق کی پھوار سی چھڑک دیتا تو وہ انداز گفتگو بدل کر کہتا "پر ولیتو تیری خاطر مٹھی بھر لے لوں گا میں بھی۔ ولیتو بچی کا جی برا کروں، تو کہاں جاؤں میں بڈھا کھوسٹ؟"

ننھی ولیتو اُچھلتی کودتی اپنے گھر میں گھس جاتی۔ گھڑے کے ڈھکنے پر رنگ کی گھنگھنیاں ڈالے پلیٹی اور بابا عمرو کے سامنے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے باہوں کو پنڈلیوں پر لپیٹے بیٹھ جاتی۔ بابا عمرو چاولوں کے تصور کو مونگ میں بدلتے دیکھ کر یوں ہنستا جیسے نیا نیا رہٹ رُک رُک کر چل رہا ہو اور پھر اُس کے قہقہے گونجیلی کھانسی میں تبدیل ہو جاتے۔ پسلیوں کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ کر سامنے پڑوسی کی دیوار پہ چٹاخ سے تھوک کر کہتا "یہ چاول کہاں سے آئے ننھو؟"

"کرپالو کی دکان سے۔" ولیتو آنکھیں جھپکا کر مسکراتی۔

اور بابا عمرو کہتا "میں سمجھا ولیتو نے ولایت سے چاول منگائے ہیں!"

گاؤں بھر میں مشہور تھا کہ بابا عمرو کا دل بھٹیارن کے توے کی طرح کالا ہے۔ اس بڈھے نے کسی سے محبت نہیں کی۔ یہ دوزخی ہے دوزخی!

بابا عمرو نے محنت مزدوری کر کے جوانی گزاری۔ ادھیڑ عمر میں شادی کی۔ چار مہینوں کے بعد بیوی دق میں مبتلا ہو گئی اور جب مری تو بابا عمرو کو خدا کا شکر ادا کرتے سُنا گیا۔ کہتے ہیں۔ بیوی کو دفنا کر جب وہ گاؤں میں آیا۔ تو سیدھا مسجد میں جا گھسا شکرانے کے نفل ادا کئے اور ہاتھ اٹھا کر بلند آواز میں دعا کی "میرے اللہ! تو بڑا بے پروا ہے۔ اس لئے شکایت فضول ہے

تو جو کرتا ہے۔ اچھا کرتا ہے۔ تیری مرضی یہی تھی تو میں کون ہوتا ہوں ناک بھوں چڑھانے والا۔ شکر ہے تیرا شکر ہے۔ شکر ہے!"

مولوی جی نے نماز جنازہ کے روپے کو جیب میں ٹٹول کر کہا: "اسے کہتے ہیں توکّل۔"

اور کسان جو توکّل کا مطلب نہیں جانتے تھے بولے "دل ہی کو نہ ہو گیا کمبخت کا۔ کچھ آنچ ہوتی اُس میں تو جوانی میں بیاہ کر لیتا۔ اب تک بچے جوان ہوتے وہ کماتے یہ کھاتا۔ اور اللہ کا نام جپتا ہے وقوف کہیں کا سودائی ہے بڑے ہی بھوت کا سایہ ہے بے چارے پہ!"

بابا عمرو نے زندگی بھر میں تین چیزوں سے محبّت کی۔ خُدا سے ننھی دتیہ سے۔ اور بوڑھی بلی شکری سے! جوانی میں ایک لڑکی سے اُنس پیدا ہوا ہی تھا کہ وہ پردیس میں بیاہ دی گئی اور محبت کی نودمیدہ کلی بابا عمرو کے دل میں گھٹ کر مرجھائی اور خاکستر بن کر رہ گئی!

کبھی کبھی مسجد کی دیواریں لیپ آتا۔ گلیوں سے کنکر ہٹاتا رہتا۔ مسافروں کے لئے گھر گھر سے روٹی مانگتا۔ گاؤں کی معاشرتی زندگی میں اُس کا صرف یہی دخل تھا کہ کوئی مرے تو جنازے کو کاندھا دے لے۔ کوئی بیاہا جائے تو دُعائے خیر میں شریک ہو کر مٹھی بھر تل اور شکر لے اور ننھے بچوں میں بانٹ دے۔ گاؤں کا کنواں صاف کیا جائے تو جگت پر آ کر بیٹھ رہے۔ رسّی بٹتا رہے اور

گنگناتا رہے۔ "لا الٰہ الا اللہ۔ لا الٰہ الا اللہ" اُسے نہ سرما کی راتوں میں چوپال کی محفلیں لبھا سکتی تھیں، نہ ساون کے دنوں میں کھلیانوں کی سنگیت بھاتی تھیں۔ اُس کی کھانسی گاؤں والوں کو اُس کے وجود سے منکر نہ ہونے دیتی تھی۔ ورنہ وہ گاؤں میں رہ کر بھی گاؤں میں نہ تھا۔

جب رات کا اندھیرا اپنے پوربی آنچل کو پو کے چشمے میں جھگو لیتا اور کائنات کی نیندوں میں انگڑائیاں کنمنانے لگتیں، تو بابا عمرو آنکھیں کھولتا اور دیمک خوردہ دروازے کے رخنوں میں دھندلے اُجالوں کو مسکراتا دیکھتا تو نصف گنجے سر پہ ہاتھ پھیر کر کلمہ پڑھتا۔ خرخراتی شکری کو بغل سے نکال کر پائنتی پر بٹھا دیتا۔ کونے میں ایک گھڑے سے کوزہ بھرتا، وضو کرتا اور نماز پڑھتا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ صبح کی نماز پڑھ لو، تو سمجھو اللہ کی نگری میں داخل ہوگئے۔ دوسری نمازوں کی توفیق ہو تو پڑھو۔ پر ہمیں تو اللہ کی نگری کا ایک کونہ چاہیئے۔ جیسے یہاں رہے ویسے وہاں بھی کہیں سمٹے پڑے رہیں گے۔ بس صبح کی نماز قضا نہ ہو۔"

جب شفق کا سیلاب، تھم پڑ جاتا اور منڈیروں اور پیڑوں پر چڑیاں چہچہاتیں تو وہ پیٹھ پہ ہاتھ باندھے قریب کے کھیتوں میں گھومنے نکل جاتا۔ کبھی کبھی شکری بھی اُس کے ساتھ ہو لیتی۔ مینڈوں کے سوراخوں کو سونگھتی، نرم نرم گھاس پہ لوٹتی اور پھر بابا عمرو کے پاؤں سے لپٹ کر اُس کے ٹخنوں سے اپنے ریشمیں پنجے رگڑتی۔ بابا عمرو مسکرا کر کہتا "ہٹ جا شکری!" — اور جب شکری

لپک کر کھیت کے پرلے سرے پر پہنچتی اور لمبی تھرتھراتی میاؤں کرتی، تو بابا عمرو ہنس کر کہتا "شریر!"

واپس آکر آٹا گوندھتا۔ روٹی پکاتا۔ اور پیاز، گُڑ یا ولیتو کے ہاں کی دال سے کھانا کھاتا۔ پچھلی کمائی میں سے کبھی کبھی ایک پیسہ نکالتا اور کرپا لو کی دکان پر سے شکر بھی لے آتا۔ کھانے سے فارغ ہو کر رسیاں بٹتا۔ فضا میں تیرتی ہوئی ابابیلوں کو دیکھتا جو دُور سے تو سی پرے سے معلوم ہوتیں۔ رسّی بٹتے بٹتے تھک جاتا تو شکری کو گود میں بٹھا لیتا۔ گردن سے چمٹا لیتا۔ اُس کے چاروں پنجے ہتھیلی پر جما کر اُسے نچاتا اور پھر اس کی نیلی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر کہتا "شکری۔ تو بچی تھی شکر چاٹتے چاٹتے شریر ہو گئی ہے، میاؤں کرتی ہے؟ مسی کہیں کی! دیکھ۔ چڑیاں نہ کھایا کر۔ میں نے دیکھا ہے کہ جس روز تو نے چڑیا کھائی۔ تجھے بد ہضمی ضرور ہوئی۔ میرے ساتھ ایک دو لقمے زہر مار کر لیا کر۔ اور اللہ اللہ کیا کر۔ سمجھی؟" — شکری آنکھوں کو نیم وا کر کے ایک ہلکی سی میاؤں کرتی اور اپنا جسم بابا عمرو کے مرجھائے ہوئے بازو سے رگڑتی۔ بابا عمرو خوش ہو کر ہنستا اور کھانستا۔ نیا نیا رہٹ رُک رُک کر چلنے لگتا۔ تانبے کے کنوئیں میں پتھر لڑھکنے لگتے۔ ولیتو آنکلتی تو اُس سے عجیب عجیب باتیں کرتا۔ "نخو۔ تو نے مجھے رات کو کئے بار یاد کیا؟"

ولیتو اس کے گھٹنے پر ٹھوڑی ٹیک کر کہتی "دس بار۔ بیس بار۔ چار بار۔"

وہ ہنستا تو ولیتو کہتی: "بابا عمرو! میں نے نئی گڑیا بنوائی ہے۔ دکھاؤں؟
بابا عمرو۔ میری نئی گڑیا ہے نا؟ وہ بولتی ہے، ہے نا بابا عمرو؟ وہ کہتی ہے
بابا عمرو بڑا اچھا بابا عمرو ہے!"

"ٹھیک کہتی ہے تمہاری گڑیا۔" بابا عمرو کہتا۔ "بابا عمرو سچ مچ بہت ہی اچھا
بابا عمرو ہے۔ پر تو خود کیا سمجھتی ہے بابا عمرو کو؟ — بتا — بابا عمرو
کیسا ہے؟"

"بابا عمرو بابا عمرو ہے۔ بس!" وہ کچھ سوچ کر کہتی "عید کب آئے گی؟
ہیں بابا عمرو؟"

بابا عمرو انگلیوں پر حساب کر کے کہتا "بس کوئی دس دن کم پانچ مہینے
بعد۔"

اور ننھی ولیتو ہونٹ سکیڑ کر کہتی "کل کیوں نہیں آتی بابا عمرو؟ ہم تو
کل عید منائیں گے۔"

"کیوں نہیں؟ کیوں نہیں؟" بابا عمرو رسّی بٹنا بھول جاتا۔

"ابھی کیوں نہ منا لیں۔ میں اس ٹھنٹے پر جھولا ڈال دوں گا تمہیں۔ تم گھر سے
پکا لانا حلوہ۔ بس بس کرتا سوجی کا حلوہ — تم پلنگ بڑھانا۔ میں حلوہ
کھاؤں گا۔"

"میں بھی کھاؤں گی حلوہ بابا عمرو!" ولیتو بابا عمرو کے کاندھوں پر اپنی

کُھنیاں ٹیک دیتی!

بابا عمرو کہتا "اچھا تو میں پینگ بڑھاؤں گا اور اگر میرے ہاتھ چھوٹ گئے تو جانتی ہو کہاں گروں گا؟ ـــ حلوے پر!"

ولیتو ہنسنے لگی۔ اور پھر اچانک سنجیدہ ہو کر کہتی "بابا عمرد ـــ نئے نئے کپڑے بھی ہوں گے۔ ہے نا؟"

"ہاں۔"

"اور گڑیاں؟"

"ہاں۔"

"اور پٹاخے؟"

"ہاں ہاں۔"

"اور پھلجھڑیاں؟"

"ہاں ہاں پھلجھڑیاں بھی!"

ولیتو تالیاں بجاتی ناچتی گھر کی طرف دوڑنے لگی اور پکارتی "عید آگئی۔ بابا عمرد کہتا ہے! ـــ اچھا بابا عمرد!"

شام پڑے تک ولیتو اور شکری اس کا دل لبھاتیں۔ اندھیرا پڑتے ہی وہ کھانا کھاتا۔ کڑوے تیل کا دیا جلا کر لا اِلٰہَ اِلّا اللہ کا ورد کرتا اور جب سونے لگتا تو پکارتا "شکری بی ـــ ہے شکری بی!"

"میاؤں۔" چوکھٹ پر سے آواز آتی۔

"اُدھر آجا۔" بابا عمرو پیار سے کہتا۔

ٹنکری اُچک کر بابا عمرو کی بغل میں گھس جاتی اور خُرخُر کی لوری اس پہ غنودگی سی طاری کر دیتی۔

ایک روز وہ دیر تک گلی کی اس نکڑ کو پلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ جہاں سے ولیتو تالیاں بجاتی ناچتی نمودار ہوا کرتی تھی۔ جب سائے ڈھلنے لگے تو گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر اُٹھا۔ رسی اتار کھاٹ پر پھینک دی اور ولیتو کے گھر کی طرف چل دیا۔ ٹنکری اُس کے ساتھ ساتھ تھی۔

آنگن میں قدم دھرا تو دیکھا کہ ولیتو کھاٹ پر پڑی کراہ رہی ہے۔ اُس کا باپ اُس کے سرہانے بیٹھا تسبیح گھما رہا ہے اور اُس کی ماں قریب ہی الاؤ پر اینٹ کا ایک ٹکڑا گرم کر رہی ہے۔

ولیتو کا باپ کہہ رہا تھا: "ابھی بُلا لاتا ہوں بابا عمرو کو۔ پر اُس کی کھانسی بڑی خراب ہے نا۔ تمھیں نیند نہیں آئے گی۔"

"میں آگیا ہوں ننھو۔ میں بالکل نہ کھانسوں گا یہاں۔" بابا عمرو ٹنکری کو اپنے پاؤں سے الگ کرتے ہوئے بولا۔

ولیتو مسکرانے لگی اور دونوں ہاتھ اُٹھا کر بولی: "بابا عمرو بڑا اچھا بابا عمرو ہے۔"

بابا عمرو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ بولا "میں حیران تھا ولیتو بیٹی نے آج میری خبر کیوں نہ لی۔ اسی فکر میں کئی بار رسّی کو اُلٹے بل دیتا رہا۔ کئی بار شکری نے بھی ایسی میاؤں کی جیسے ولیتو کو پکار رہی ہے۔ واہ ری ننھو، تم بیمار ہو گئیں اور مجھے پتہ ہی نہ چلا۔ کیا ہو گیا اِسے ؟"

ولیتو کا باپ بولا "کل شام سے پیٹ میں درد کی شکایت کر رہی تھی صبح کو اُٹھی تو بخار سے تپ رہا تھا سارا جسم۔ کئی بار تمہیں یاد کیا۔ پر میں نے کہا تم پریشان ہو گے۔ کب سے تمہارے نام کی رٹ لگا رکھی ہے۔ کہتی ہے بابا عمرو بڑا اچھا بابا عمرو ہے۔ بابا عمرو ہمیں پھلجھڑیاں لا دے گا۔"

"ہاں ہاں۔ پھلجھڑیاں۔ بابا عمرو پھلجھڑیاں لا دو نا۔" ولیتو نے اپنا تپتا ہوا ننھا ہاتھ بابا عمرو کی مرجھائی ہوئی انگلیوں پہ رکھ دیا۔

ولیتو کا باپ بولا "کرپالو کی دکان پہ پھلجھڑیاں ہیں نہیں مسجد کی پرلی طرف گاموں کے بیٹے وارث نے دکان کھولی ہے۔ پہ گڑ اور تمباکو کے سوا اور دھرا کیا ہے وہاں۔ قصبے میں کوئی جانے والا ملتا نہیں۔ اور ولیتو ہے کہ بابا عمرو اور پھلجھڑیوں کو بھولتی ہی نہیں۔ بابا عمرو تو مل گیا اسے۔ اب پھلجھڑیاں کہاں سے آئیں ؟"

"قصبے سے۔" بابا عمرو بولا۔

"پر لائے گا کون ؟"

"میں۔"

"تم؟"

"ہاں ہاں میں۔"

"پر بابا! وہ گھٹا ٹوپ بادل اُمڈ رہا ہے اُتر سے — میں تو کہتا ہوں پل بھر میں جل تھل ایک ہو جائیں گے۔ تم بڈھے نڈھال آدمی۔ کہاں بھٹکتے پھرو گے؟"

اچانک ولیتو پکاری "بابا عمرو، پھلجھڑیاں۔ اچھی سی۔ بہت سی۔"

"جو نیلے پیلے تارے برسائیں۔" بابا عمرو، ولیتو پر جھک گیا۔

"ہاں ہاں بابا عمرو!"

"جو رات کو دن کر دیں؟"

"ہوں۔"

"جو کرپالو کی دکان جلا دیں؟"

"ہاں ایسی ہی۔ کرپالو بڑا بُرا ہے۔ بابا عمرو بڑا اچھا ہے۔"

"تو میں ابھی آیا۔"

بابا عمرو اُٹھا۔ ٹھکری اُس کے ساتھ ہو لی۔ ولیتو کے ماں باپ نے اُسے بہتیرا سمجھایا۔ مگر وہ بولا "چار ہی تو قدم ہیں۔ اور اگر ولیتو کے لئے مجھے ولایت بھی جانا پڑے تو سمندروں کو چیرتا نکل جاؤں۔ میں ایسا گیا گذرا نہیں۔ اچھا بھلا ہوں۔ کہانی

نہ ہوتی تو قرآنِ مجید کی قسم —— لاہور سے ہو آتا ایک دن میں۔"

اور جب ولیتو کے باپ نے اُسے پھلجھڑیوں کے لیے رقم دینا چاہی تو وہ بیتاب ہاتھ جھٹک کر بولا "میرے من میں جو بات آئی ہے وہ کہنے کی نہیں ورنہ کہہ دیتا میں تمہارے لیے غیر ہی، ولیتو کے لیے غیر نہیں۔"

جھونپڑے میں پہنچ کر اپنی پونجی سے اٹھنّی نکالی، زنگرنی کو بڑی مشکل سے اندر بٹھایا اور دروازہ بند کرکے قصبے کو چل دیا۔

ابھی وہ گاؤں سے ایک ہی کوس دور ہوگا کہ تیز ہوا سے درخت انگڑائیاں لینے لگے، خشک پتے کھڑکھڑاتے ہوئے ٹوٹے اور زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ بادل چھا گئے اور بوندا باندی ہونے لگی مگر بابا عمرو سب لمبے لمبے ڈگ بھرتا، عصا ٹیکتا بڑھتا چلا گیا اور جب قصبے میں پہنچا تو جھٹپٹا ہو رہا تھا۔ اٹھنی کی پھلجھڑیاں خرید کر چادر میں لپیٹیں اور تہمد کے کسنے میں اڑس کر پلٹا۔ یوں چلا، جیسے بیس بائیس سال کا گبھرو اڑا جا رہا ہو۔ گاؤں کے قریب ندی گرج رہی تھی۔ پھلجھڑیوں کو پگڑی میں لپیٹ کر چھپاتے ہوئے پانی کو چیر گیا۔ ابھی گاؤں تک نہیں پہنچ پایا تھا کہ گھٹا نے ایک دم اپنا دامن نچوڑ دیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے آسمانوں سے سمندر انڈیل دئیے گئے ہیں۔ بوندوں کی جگہ آبشار گرنے لگے۔

بابا عمرو کو پھلجھڑیوں کی اتنی فکر تھی کہ بدن پر صرف تہمد کو رہنے دیا اور باقی سب کپڑوں میں پھلجھڑیوں کو لپیٹ لیا۔ کبھی بغل میں دباتا کبھی مٹھی میں جکڑ لیتا۔ پھسلتا تو پھلجھڑیوں والا ہاتھ اوپر ہی رہتا۔ جب وہ گاؤں میں پہنچا تو چوپال سے دروازے تک

بیٹھے ہوئے لوگوں نے زور زور سے قہقہے لگائے اور بولے "بڈھا ویسے ہی گھناؤنا ہوتا ہے، پر جب بھیگ جائے تو توبہ — بالکل بھوت!"

بابا عمرو کوئی جواب دینے کے لئے ٹھٹکا۔ مگر فوراً اُس کے دماغ میں پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔ قدم بڑھائے اور جب ولیتو کے گھر پہنچا تو دہلیز لانگتے ہی پوچھا "کیسی ہے ننھو؟" — اور پھر ولیتو کو مسکراتا دیکھ کر اُس نے پھلجھڑیوں پر لپٹے ہوئے کپڑے کھولے۔ سولہ پھلجھڑیوں کا انبار سا ولیتو کے سر پہ رکھ دیا۔ داڑھی سے پانی نچوڑ کر بولا "چھوڑوں ایک پھلجھڑی؟ — دیا سلائی دینا بھیّا!"

ولیتو کے ماں باپ بڈھے کی حالت دیکھ کر بھونچکا سے رہ گئے تھے۔ اُس کے ارد گرد ننھی ننھی ندیاں بل کھاتی فرش کے چاروں طرف رینگی جا رہی تھیں۔ سر کے نیچے کھچے بالوں کا پانی اکٹھا ہو کر اُس کی ناک کے بانسے پر سے چاندی کا ایک تار بنا تا اُس کے کپکپاتے ہوئے سینے پہ گر رہا تھا۔ ولیتو کی ماں نے بڑھ کر دیا سلائی کی ڈبیا اُٹھا دی۔ باپ نے بابا عمرو کے قریب آ کر کہا "پر بابا! تم آگ تو سینک لو۔ ٹھٹھر رہے ہو۔ نیلے پڑ رہے ہو۔"

"کون ٹھٹھر رہا ہے؟ کون نیلا پڑ رہا ہے؟" بابا عمرو دیا سلائی جلا کر بولا۔ "واہ۔ کیوں ری ننھو؟" — کانپتے ہاتھ بڑی مشکل سے دیا سلائی اور پھلجھڑی کو ایک دوسرے کے قریب لا سکے اور جب پھلجھڑی چھوٹی ہے تو بابا عمرو کو وہ

ہنسی چھوٹی۔ وہ ہنسی چھوٹی کہ چہکتی ہوئی ولیتو کے ہاتھ میں پھلجھڑیاں تھما کر زمین پہ بیٹھ گیا اور جب ہنسی نے گرنجیلی کھانسی کی شکل اختیار کر لی، تو وہ سینے کو دونوں ہاتھوں سے دباتا اٹھا اور بولا "ولیتو بیٹا! مجھے تو کھانسی آنے لگی۔ کل صبح پھر آؤں گا۔۔۔ ہیں ننھو؟"

"بابا عمرو بڑا اچھا ہے۔" ولیتو بستر پہ اٹھ بیٹھی۔ "بابا عمرو! ایک پھلجھڑی تم بھی لے لو۔"

ہنستا، کانپتا، کھانستا۔ وہ ولیتو کے قریب آیا۔ پھلجھڑی لے کر مٹھی میں دبائی اور اپنی جھونپڑی کو چل دیا۔ جہاں ٹنکری اپنے نکیلے پنجوں سے دروازے کو لگاتار کھرچ رہی تھی۔

آدھی رات تک ولیتو کا بخار بھی اتر گیا اور درد بھی رک گیا اور جب صبح کو اٹھی تو بابا عمرو کے ہاں جانے کو مچل پڑی۔ باپ نے اسے اٹھایا اور بابا عمرو کے پاس لے چلا۔

جھونپڑے کا دروازہ کھلا تھا۔ دونوں بابا عمرو کے قریب پہنچے تو ایک عجیب سی مکھی بابا عمرو کے ادھ کھلے منہ سے نکلی اور اس کے چہرے کا طواف کرتی ولیتو کے سر سے ٹکراتی دروازے سے باہر نکل گئی۔ بابا عمرو کے پیٹ پہ بیٹھی ہوئی بلی نے زور سے میاؤں کی اور پنجہ مار کر بابا عمرو کی داڑھی میں پھنسی ہوئی پھلجھڑی کو نیچے گرا دیا!

کانی آنکھ

چودھری نورنگ کی ایک آنکھ کانی کیونکر ہوئی! یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔
کیونکہ ہر ملنے والے کو اُس نے اپنی آنکھ کے بیٹھ جانے کی الگ وجہ بتائی تھی۔
وہ کہا کرتا تھا بچپن ہی سے رگ رگ میں چلبلاہٹ بھری تھی سولہ سال کی عُمر تھی، اور ستائیس سال کے ایک کڑیل گبرو سے کبڈی کھیلنے کی سوجھی۔ لنگوٹ کس کر جب میدان میں کودا ہوں۔ اور ڈھول کے اردگرد گھوم کر اور دایاں بازو تان کر "یا علی" کا نعرہ لگایا ہے تو دیکھنے والوں نے کہا "بجلی نے انسان کا روپ دھارا ہے!" ادھر سے میرے مقابلے والا نوجوان بھی ـــ خُدا جھوٹ نہ بلوائے ـــ اچھے خاصے دبدبے سے نکلا۔ مجھ پر چیتے کی طرح جھپٹا۔ اتنی بڑی بڑی آنکھیں نکالتا جب وہ میرے قریب آیا ہے اور ہاتھ بڑھایا ہے گردن پر ضرب لگانے کے لئے تو میں نے ریڑھ کی ہڈی کے بالکل بیچوں بیچ گھونسا جما دیا۔ بچہ گیا ہے چارا زمین پر۔ میں اپنی پگڑی کے دونوں طرّے درست کرتا جب اپنے ساتھیوں میں پہنچا تو ایک بولا "ارے نورنگ! تمھاری آنکھ؟" "میری آنکھ؟" میں نے کہا۔ ہاتھ لگایا تو اوسان ٹخنوں میں جا گرے۔ لاہور کے بڑے ہسپتال میں علاج کرایا۔ ساڑھے سات سو روپے فیس دی۔ ڈاکٹر کہنے لگے "مصنوعی آنکھ لگوا لو۔ صرف

پانسو لگیں گے" ــــ میں نے کہا "چلیے پانچ ہزار لگیں یہاں ہاتھ کے میل کی پرواکوئی تھوڑی کرتا ہے۔ میں اپنے کانا ہونے کا اشتہار نہیں دینا چاہتا بس بخشیے۔"

چودھری نورنگ یہاں پہنچ کر خاموش ہو جاتا اور اپنے مخاطب کو منتظر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے حقے کی نے سے لٹکتے ہوئے دھاگوں کا جائزہ لینے لگتا۔ عام طور پر مخاطب پوچھتا "اور آپ کے مقابلے والا جوان؟"

چودھری تسلی کی گہری سانس لیتا اور مسکرا کر کہتا "اس کی ریڑھ کی ہڈی چانول چانول ہو گئی۔ ہسپتال اٹھا کر لے گئے ــــ یہیں خیراتی ہسپتال میں ــــ دوسرے دن اللہ میاں کے ہاں سدھار گیا بے چارا۔"

اور اگر مخاطب پوچھ لیتا "کیا نام تھا اُس کا؟"

تو چودھری کی سانولی رنگت پر کالکھ پھیل جاتی۔ گھنی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر کہتا "دلیر خاں۔"

سننے والے حیران رہ جاتے۔ کیونکہ کبڈی کی تاریخ میں دلیر خاں نامی کھلاڑی کا ذکر کبھی نہیں آیا تھا۔

ایک بار چودھری کے ہاں انجمن امدادِ باہمی کا سب انسپکٹر مہمان تھا۔ چوپال پر دہقانوں کا ہجوم تھا۔ سب انسپکٹر نے چودھری سے کچھ سرگوشی کی تو وہ زور زور سے ہنسنے لگا اور بولا "واہ خواجہ صاحب! یہ بھی کوئی پردے کی بات

ہے! سارا علاقہ جانتا ہے کہ میری جوانی میں یہاں فساد ہو گیا تھا۔ اُدھر سے بیس جوان اور ادھر سے صرف سات۔ میں اُن میں کم عمر تھا مگر لاٹھی لے کے دشمنوں کی صف میں گھسا ہوں تو ڈھیر لگا دیئے تڑپتے ہوئے جوانوں کے۔ گرتے ہوئے ایک جوان کے نیزے کی انی میری پسلی سے ذرا چھو گئی۔ لاہور کے بڑے ہسپتال میں پونے نو سو روپیہ فیس دی۔ پر جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔"

ہمیشہ کی طرح چودھری یہاں پہنچ کر رُک گیا اور جب سب انسپکٹر نے پوچھا "دوسری پارٹی والے؟"

"دوسری پارٹی والے؟" چودھری مسکرایا "سات وہیں مر گئے اور دو نے ہسپتال میں جا کر دم توڑ دیا — یہیں خیراتی ہسپتال میں — دعوے ہُوا مقدمہ چلا۔ بلوے کا مقدمہ قرار پایا۔ میرے ساتھیوں کو چار چار سال قید آئی اور میں بچ نکلا۔"

"کیسے؟" سب انسپکٹر نے پہلے بسنے پر کہنی ٹیک کر پوچھا۔

چودھری کی سانولی رنگت میں چمک سی آ گئی۔ کھنکار کر بولا "میں نے ڈاکٹر سے چھٹی لے لی۔ دس تاریخ کو بلوہ ہوا تھا اور چھٹی لکھی تھی کہ میں آٹھ تاریخ سے ہسپتال میں تھا۔ دشمنوں کے وکیل کی چیں بول گئی۔ کہنے لگا "جھوٹی چھٹی ہے" — میں نے کہا "ہاں ہاں تیرے باوا نے جو دی ہے — جھوٹی ہے!"

"میرا تو خدا کی قسم ہاتھ اُٹھ جاتا پر منصف نے گرج کر کہا۔" وکیل چُپ رہ۔ ہم چودھری نورنگ کو برسوں سے جانتے ہیں۔ اُس کی خاندانی پر حرف نہ آئے ورنہ ہتکِ عزت کا دعویٰ کر دیا جائے گا۔' وکیل میاں کا قلم ٹھک سے فرش پر جا گرا۔"

یہاں پہنچ کر اُس نے سب انسپکٹر کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا۔ پُوری قوت سے قہقہہ لگایا اور اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا "بھئی لے آؤ نا اپنی اپنی قسطیں۔ کچھ 'وصولی' ہو جاتے تو کھانا وانا کھائیں خواجہ صاحب! میری باتیں جانے لمبی کیوں ہو جاتی ہیں کم بخت۔"

یعنی اگر کوئی شخص بلوے کی دوسری پارٹی والوں کے نام پُوچھنے کی جرأت بھی کرے تو بات کو ختم ہوتا دیکھ کر چُپ ہو رہے۔ پر جو اصل بات تھی وہ چھپی نہ رہ سکی۔ مجھے اپنے دوست ربّانی کی ماں نے یہ قصہ سنایا۔ ایک جُھکے ہوئے چھپر تلے بیٹھی وہ چرخہ کات رہی تھی کہ میں اُس کے پاس گیا اور کہا "بیل تو ایک دن میں بِک جاتا ہے خالہ۔ اتنے دن کیوں لگا دیئے ربّانی نے؟ میں تو تھک گیا ہوں تیرے بیٹے کی راہ تکتے تکتے۔"

وہ چرخے کی ہتھی کو ہتھیلی سے ٹھونکتی ہوئی بولی "آ جائے گا۔ آ جائے گا اونے پونے بیچنے کو تو وہ بیل لے نہیں گیا۔ علاقے بھر میں گھوم جاؤ تو ایسا بیل دیکھنے میں نہ آئے گا۔ سودا چکانے میں کچھ دیر لگے گی۔ آ جائے گا۔"

میں نے کہا "گاؤں میں کوئی شناسا ہے نہیں کہ اُس کے پاس بیٹھوں۔ جہاں جاتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں۔ شہری آیا ہے یعنی موروں میں کوا آن بیٹھا ہے۔ عجیب لوگ ہیں۔ کمبخت یہ نہیں جانتے کہ ہوں تو میں بھی دیہاتی۔ پر یہ عینک اور یہ اُدھ کتری مونچھیں۔ بدگمان ہو جاتے ہیں۔ یہیں پڑا رہتا ہوں۔ وقت نہیں گزرتا خالہ تُو کوئی کہانی سُنا!"

وہ چرخے کی گھوں گھوں میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولی "واہ تیری عمر ہے کہانی سُننے کی؟ تُو تو مجھے اچھا بھلا سیانا لگتا ہے۔ میں تیری خاطر تو بہت کرتی ہوں بیٹا! میں تو سمجھتی ہوں ربانی بیٹا میرے پاس بیٹھا ہے پر تُو تو گھبرا چلا ہے۔ اب تیرا جی کیسے بہلاؤں؟"

میں نے کہا "کوئی کہانی سُنا کر۔"

چرخے کو پرے دھکیل کر بولی "کہنا تو نہیں چاہیئے۔ پر تُو ہے بڑا ضدی۔ بالکل ربانی کی طرح۔ پرسوں میں نے ہزار بار کہا۔ حلوہ پکے گا۔ حلوہ پکے گا۔ پر تُو نے بھی مسور کی دال کی ایسی رٹ لگائی کہ آخر کھا کر ہی دم لیا۔" کچھ سوچ کر بولی "شام کو کھانے کے بعد ایک قصہ سناؤں گی تجھے۔ بس؟"

"بس۔" میں نے خوش ہو کر کہا "اچھی خالہ!"

اور جب شام کو چنوں کی دال اور پراٹھوں سے پیٹ بھر کر میں نے بوڑھی خالہ کو اُس کا وعدہ یاد دلایا تو وہ ہنس کر بولی "اسے! بھولا نہیں تُو؟ اچھا

بتا! جگ بیتی کہ آپ بیتی۔"

"آپ بیتی۔" میں نے فوراً جواب دیا۔

"اور اگر آپ بیتی کوئی نہ ہو؟" وہ مسکرائی۔

"تو جگ بیتی۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"اچھا تو لے سن۔ تو نے گاؤں کے بوڑھے چودھری کو دیکھا ہے؟ جانتا ہے اس کی آنکھ کانی کیسے ہوئی؟ تو کیا جانے! کوئی بھی نہیں جانتا۔ صرف خدا جانتا ہے یا میں جانتی ہوں۔ مدتوں کا ذکر ہے۔ چودھری نیا نیا جوان ہوا تھا۔ نیلی پگڑی پر ابرق چھڑک کر جب طرہ جماتا تھا سر پر اور لٹھے کے تہمد کو کھڑکھڑاتا، زرین جوتے کو چرچراتا جب گلیوں میں خوں خاں کرتا گزرتا تو لوگ جل جاتے پر کیا کرتے! چودھری تھا۔ کوئی اُلٹی بات کہہ دیتے تو دوسرے دن پلس آ دھمکتی۔"

"شکل صورت کا اُن دنوں بھی یہ ویسا ہی تھا۔ اب تو خون کم ہونے سے رنگت سانولی پڑ گئی ہے اس کی۔ اُن دنوں بالکل کوا تھا۔ بس بات ساری یہی تھی کہ اچھے کپڑے پہنتا تھا اور خوشبو لگاتا تھا۔ ایک بار گلی میں اس کے کان سے عطر کی پھریری گر گئی۔ ایک لڑکی اسے اٹھا کر اپنی گڑیوں پر پھیرتی پھری۔ کہتے ہیں ایک سال تک گڑیوں سے مہک اٹھتی رہی۔ ولایت سے منگاتا تھا عطر۔ سو بڑا ایسا ویسا تھا!"

• اسی گاؤں میں ایک لڑکی رہتی تھی۔ نام تھا اُس کا ـــ اُس کا نام ـــ بس رحمت ہی سمجھ لو ـــ رحمت اچھے کھاتے پیتے زمیندار کی بیٹی تھی۔ بلا کی خوبصورت اور غضب کی نایاب۔ کسی کو آنکھ بھر کر دیکھتی تو راکھ کر سکتی تھی۔ پر اُس نے کسی کو آنکھ بھر کر دیکھا ہی نہ تھا۔ اوّل تو گھر ہی میں پڑی رہتی اور جو بہت تیر مارتی تو پنگھٹ پر جا نکلتی۔ پر نظریں اپنے پاؤں کے انگوٹھوں پر جمی رہتیں۔ کہتے ہیں ایک بار اس کا ایک بال گر گیا کنوئیں کی جگت پر۔ جب وہ چلی گئی تو یہ بال ایک لڑکی کو ملا۔ کوئی کہتی، سونے کا تار ہے! کوئی کہتی ریشم کا دھاگا ہے! ایک نے تو یہاں تک کہہ دیا: رکھ دے ری اسے یہیں کسی پری وری کا بال دکھتا ہے! ابا! لینے کے دینے نہ پڑ جائیں"۔ سو ایسے بال تھے اُس کے ـــ اور اُس کی آنکھیں اور ہونٹ اور دانت ـــ اب کیا بتاؤں۔ اِس عمر میں ایسی باتیں کرتے شرم آتی ہے بیٹا۔ تُو نے کتابوں میں تصویریں دیکھی ہوں گی میموں کی؟ بس اُسے بھی میم ہی سمجھ لے۔ پر ہاں۔ اُس کی آنکھیں چودھری کے چہرے سے بھی زیادہ کالی تھیں۔ بس یہی فرق تھا میم میں اور اس میں"۔

"ایک دن کا ذکر ہے۔ ایک ملڈے نے اُسے چھیڑا۔ وہ چپ چاپ چلی جا رہی تھی کہ اچانک ایک ننھا سا کنکر اس کی پیٹھ پر آ گرا۔ پلٹ کر دیکھا تو وہ ملڈا کھڑا ہنس رہا ہے اور ہاتھ جوڑ رہا ہے اور بتاشوں کی پوٹلی دکھا رہا ہے۔

رحمت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جوتا اُتار کر لپکی اور لمڈے کے سر پر تڑاتڑ کئی بادام توڑ دیئے ۔ لوگ جمع ہو گئے ۔ لمڈے کو وہ بے بھاؤ کی پڑیں کہ ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ کر چت لیٹ گیا اور لڑکی کی دھاک بندھ گئی سارے گاؤں میں۔ جہاں سے گزرتی۔ گبرو راستہ چھوڑ دیتے ۔۔ بڑے جلال والی لڑکی تھی۔''

''اب چودھری کی سُن! جوانی نے تو آگ لگا ہی رکھی تھی۔ اس لڑکی کے حُسن نے آگ کو ہوا دے دی۔ نیلی پگڑی کا طرہ ہاتھ بھر لمبا ہو گیا۔ پہلے صرف کانوں میں عطر کی پھریریاں رکھتا تھا۔ اب تو نتھنوں میں بھی رکھنے لگا۔ تو ہنستا ہے بیٹا! سچ کہتی ہوں یہی کرتا تھا وہ۔ پر اُس سے پُوچھتا کون؟ کپڑے اُتار کر بھی پھرتا تو کوئی اُنگلی نہ اٹھاتا۔ دولت والا تھا نا۔ اس نے بوڑھی دھوبنوں اور میراسنوں کے ہاتھ پیغام بھیجنے شروع کیئے۔ نتیجہ سب کا یہی ہوتا کہ وہ جُوتے کھا کر آتیں اور چودھری سے دونی چونی لے کر گھر جا بیٹھتیں۔ جو ایک بار پیغام لے کر گئی۔ اُس نے پھر رحمت کے گھر کا رُخ نہ کیا۔''

''باتوں سے کام نہ چلا تو چودھری نے ایک اور چال چلی۔ ریشمی کپڑے اور شہری مٹھائیاں اور نرم چمڑے کے سلیپر۔ اور سو سو کے نوٹ اور جانے کیا کیا الابلا۔ اب یہ چیزیں بھیجنی شروع کیں۔ رحمت بے چاری گھبرا گئی۔ ماں مر چکی تھی۔ بھائی اور باپ کو نہ بتاتی تھی کہ مفت میں خون خرابہ ہو جائے گا۔ ایک بار جو غصہ آیا اُسے تو ریشم کے کپڑوں کی پوٹلی لے کر بھرے ہوئے

تنور میں جھونک دی۔ پوٹلی لانے والی نے سر پیٹ لیا۔ بھاگی بھاگی نورنگ کے پاس گئی اور جب سارا حال کہہ سنایا تو چودھری کی دونوں آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ بولا "اب یوں کام نہ چلے گا۔" اور پہلو سے کمانی والا چاقو نکال لیا۔

"پر یہ ساری تو ں فاں بیکار تھی؟ جیتی جاگتی جان کے کلیجے میں چھرا گھونپنا ذرا دل گردے کی بات ہے اور چودھری کا اتنا حوصلہ کہاں! ظلم تو یہی تھا کہ اُس کی جیب بھاری تھی۔ خالی ہوتی تو ابرق جھڑ جاتا نیلے طرے سے"

"اب اُس نے چوپال پہ اپنے ساتھیوں میں بیٹھ کر دل کا غبار نکلنے کی کوشش کی۔ آہیں بھریں۔ فریادیں کیں۔ کہتے ہیں اُن دنوں اس نے دوہے بھی بنائے۔ ایک دن رحمت گلی میں جا رہی تھی کہ چودھری نے دو چار آدمیوں کے سامنے کان پر ہاتھ رکھا اور ایک دوہا الاپ دیا اونچے سُروں میں ؎

سدا نہ رہندا جوبن کالے والاں دا[1]

رحمت بے چاری بل ہی تو کھا گئی پر کیا کرتی۔ گھر آ کر بلک بلک کر رونے لگی۔ بھائی اور باپ نے وجہ پوچھی۔ یہ کس منہ سے بتاتی۔ وہ پوچھتے یہ روتی، وہ بہلاتے یہ سسکتی، وہ دھمکاتے یہ تڑپ اٹھتی۔ اتفاق سے اُسی وقت ایک شخص آیا اور دونوں کو علیحدہ بلا کر یہ سارا حال کہہ سنایا۔ دونوں کی آنکھوں میں

---

[1] کالے بالوں کا حسن سدا نہیں رہتا۔

آنسو آ گئے۔ دُکھ سے نہیں، غصّے سے۔ اس روز اُنھوں نے رحمت کو بتلائے بغیر ایک ترکیب سوچی۔ ایک دھوبن کو گانٹھ لیا اپنے ساتھ۔ وہ چودھری کے پاس یہ پیغام لے کر چلی کہ رحمت کا دل پسیج گیا ہے۔ آج تک اُس کی بے رُخی صرف دکھاوا تھی اندر سے تو وہ جل کر کباب ہو چکی ہے بیچاری۔ تم آج آدھی رات کو بے دھڑک اُس کے گھر چلے آنا۔ دروازہ کھُلا ہوگا۔ کھٹکا نہ کرنا کہ کہیں اُس کا بھائی نہ جاگ اُٹھے۔ بھوسے والے کوٹھے کے کونے میں رحمت چھپی بیٹھی ہوگی تمھارے انتظار میں۔ آؤ اور جوانی کی بہار لوٹو۔"

"دھوبن نے جب چودھری کو یہ پیغام دیا تو وہ پکارا "سچ؟"

دھوبن بولی "خدا کی قسم —" جھوٹی قسم تھی پر دھوبن کی جیب میں دس روپے جو چھنچھنا رہے تھے۔"

"بس اُس روز آدھی رات کے وقت چودھری ریشمی کپڑے پہنے طرّہ جمائے بڑے ٹھاٹھ سے رحمت کے ہاں چلا۔ دروازہ کھُلا تھا۔ بھوسے کے کوٹھے میں داخل ہُوا تو کونے سے ایک سایہ اُٹھا۔ چودھری کی سانس پر سانس چڑھی ہوئی تھی۔ رحمت سے لپٹنے کے لئے آگے بڑھا تو دوسرے کونے سے ایک اور سایہ اُبھرا۔ لالٹین جل اٹھی۔ چودھری تڑپ کر پیچھے ہٹا مگر دروازہ بند ہو چکا تھا۔ رحمت کے بھائی نے اُسے اٹھا کر بھوسے پر گرا دیا اور اُس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ چودھری نے پکارا "میں تم سے

ملنے آیا تھا۔ میں نے کہا چچا اور بھیّا کو مدتوں سے نہیں دیکھا!" پر رحمت کا بھائی بولا" ہاں ہاں ہم چمگادڑ جو ہوئے کہ آدھی آدھی رات تک بیٹھے رہیں بیٹا نورنگ کے انتظار میں۔ اب زبان کو قابو میں رکھ اور دیکھ خدا کی قدرت!"

"رحمت کے باپ نے ایک چُھرا نکالا اور بسم اللہ پڑھ کر چودھری کی آنکھ کو دونوں اُنگلیوں سے کھولا اور" کرچ" سے چُھرے کی نوک چبھو دی"

"رحمت کے بھائی نے رحمت کو آواز دی اور جب وہ اندر آئی۔ اور چودھری کی یہ حالت دیکھی۔ تو ڈر گئی بے چاری۔ اُس کے بھائی نے چودھری سے پُوچھا" نورنگ بھیّا کون ہے یہ؟" وہ تڑپ رہا تھا ادھ کٹے مُرغ کی طرح۔ بولا" میری بہن!"— کچھ اور کہنا چاہتا تھا، پر رحمت کو باہر بھیج دیا گیا اور چودھری سے کہا گیا" اگر کوئی آواز نکالی تو دُوسری آنکھ بھی جاتی رہے گی"۔ — پر آواز نکالنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ کچھ دیر کے بعد وہ بیہوش ہو گیا۔ باپ بیٹا اُٹھا کر اُس کی ڈیوڑھی کی دہلیز پر رکھ آئے۔ دوسرے دن مشہور ہو گیا کہ چودھری نورنگ کی آنکھ میں تکلا چبھ گیا ہے۔ اُسے لائل پور لے گئے —— خیراتی ہسپتال میں — وہاں کا ڈاکٹر آنکھوں کا اچھا علاج کرتا تھا۔ چند مہینوں کے بعد چودھری واپس آیا تو آنکھوں پر کالے شیشوں والی عینک لگائے۔ اس کے بعد اُس نے عشق کا نام تک نہ لیا۔ اپنے دوستوں میں بھی یہ مشہور کر دیا

کہ وہ دوہے بنانا کیا جانے۔ یہ تو سائیں علی حیدر کی سی حرفی کے کرشمے تھے!"

یہاں پہنچ کر بوڑھی خالہ رُک گئی۔ میں اب تک دم بخود بیٹھا کہانی سُنتا رہا تھا۔ اُسے اچانک خاموش ہوتے دیکھا تو پُوچھا "اور خالہ اماں۔ رحمت؟"

"رحمت؟" وہ چونک اُٹھی "وہ بیاہ دی گئی۔"

"یہیں؟"

"ہاں یہیں۔" اور خالہ بی کی بچی کھچی پلکوں نے جھک کر اُس کے جھریاں پڑے رخساروں پر مبہم سایوں کی لکیریں سی ڈال دیں۔ اگر لالٹین زیادہ روشن ہوتی تو شاید میں اُس کے چہرے سے بہت کچھ اخذ کر سکتا۔

دوسرے روز میں چھپا چھپی کر سیدھا چوپال پہ جا نکلا۔ چودھری اکیلا بیٹھا کچھ گنگنا رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر کہا "کوئی دوہا گا رہے ہیں آپ؟ — علی حیدر کا؟"

چونک پڑا۔ اور مُسکرا کر بولا "آؤ صاحب۔ ربانی ابھی تک نہیں پلٹا کیا؟"

میں نے کہا "نہیں جی۔ شاید آج آ نکلے۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تو میں

نے کہا۔ چلو آپ کے پاس ہو آؤں ۔ سارے گاؤں میں صرف آپ ہی ہیں جو پڑھے لکھوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔"

چودھری کی کانی آنکھ پھڑک اٹھی۔ گلی میں سے ایک گبرو گزر رہا تھا جس نے نیلے رنگ کی پگڑی پہ ابرق چھڑک کر بہت لمبا طرہ جما رکھا تھا۔ چودھری پکارا "ہے چھوکرے۔ یہ نیلی پگڑیاں اور یہ ابرق اور یہ عطر اور یہ طرے ورے اس گاؤں میں نہیں چلیں گے۔ یہاں شریفوں کی بہو بیٹیاں رہتی ہیں۔ سمجھا؟ لفنگا کہیں کا؟"

گبرو نے گھبرا کر طرے کو مروڑا اور کان پر لٹکا لیا، پلٹا اور ایک گلی میں مڑ گیا۔ چودھری نے پھولے ہوئے نتھنوں کو بڑی مشکل سے دبایا اور تن کر بولا "یہ چل نکلتے ہیں گلیوں میں رانجھے اور مہینوال بن کر۔ میں تو صاحب گنواروں میں گھرا بیٹھا ہوں۔ صرف اس لئے کہ باپ دادا نے یہیں جاگیر چھوڑی پچھلے دنوں تو میں نے تنگ آکر لاہور والی ٹھنڈی سڑک پہ بنگلہ خریدنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پر عزیزوں نے روک لیا۔ بولے وہاں کے رئیس برا منائیں گے۔"

چودھری کو اپنے خاص رنگ میں دیکھا تو میں نے جھٹ سوال کیا "چودھری جی آپ کی آنکھ کیسے گئی؟"

چودھری نے مسکرا کر کانی آنکھ کو ملا اور بولا "یہ جوانی کا کارنامہ ہے صاحب

میری عمر بھی کوئی بیس بائیس برس کی ہو گی۔ لاہور جا رہا تھا۔ لاٹ صاحب سے ملاقات کرنے۔ میں پہلے درجے میں بیٹھا تھا۔ گاڑی چلی تو ایک صاحب بہادر اندر آیا۔ اور مجھے جھنجھوڑ کر بولا: "تم اُدر بیٹو۔ ہم اِدر بیٹے گا"۔ میں نے کہا۔ جا بے جا۔ اپنی راہ لے۔ کسی پائدان پہ بیٹھ جا! کیوں رئیسوں کے منہ آتا ہے؟"۔ بس صاحب تڑپ ہی تو اٹھا۔ باؤلوں کی طرح مجھ پہ جھپٹا۔ میں بھی غافل تو تھا نہیں۔ اس زور سے ٹکر لگائی اُس کے سینے میں کہ کم بخت کی ٹنگیاں اوپر چڑھ گئیں اور چاروں شانے چت گر پڑا۔ گرتے ہوئے جانے اُس کا ناخن لگ گیا میری آنکھ میں یا جانے چھڑی تھی اُس کے ہاتھ میں یا کیا! پتلی میں درد سا ہوا۔ آئینے میں جا کر دیکھا تو ایک لال سی لکیر نظر آئی۔ لاہور کے بڑے ہسپتال میں سوا گیارہ سو روپے فیس دی۔ پر جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔"

میں نے کانی آنکھ سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا "شکر ہے دوسری آنکھ سلامت رہی۔" وہ چپ چاپ بیٹھا مجھے گھورنے لگا۔

"پر چودھری جی۔" میں نے کہا۔

"جی۔" وہ پہلو بدل کر بولا۔

"پر چودھری جی۔ میں کچھ ڈاکٹری جانتا ہوں۔ مجھے تو یہ کسی تیز دھار آلے کی کارستانی معلوم ہوتی ہے۔"

چودھری کا رنگ فق ہو گیا۔ کھسیانا ہو کر ہنسا اور اُٹھتے ہوئے بولا۔

"آپ بچے ہیں جی۔ آپ کیا جانیں یہ باتیں۔ اچھا تو شام کو ملیں گے۔ مجھے اب ایک ضروری کام ہے۔"

"مجھے بھی ایک ضروری کام ہے۔" میں نے کہا۔ "چند گھنٹوں کے لئے باہر کھیتوں میں گھومنا چاہتا ہوں، پر دھوپ بڑی تیز ہے۔ اگر کالے شیشوں والی عینک آپ کے پاس ہو تو عنایت کر دیجئے۔ شام کو واپس بھیج دوں گا۔"

چودھری کے ابرو کھچ کر نقطے سے بن گئے۔ بولا۔ "نہیں صاحب میرے پاس ایسی عینک نہیں۔ کبھی پہنی ہو تو!"

میں نے کہا۔ "اچھا تو کھیتوں میں نہ سہی، گھر بیٹھے رہیں گے۔ ربانی کی ماں نے آج مجھے آپ بیتی سنانے کا وعدہ کیا ہے!"

"کیا؟" چودھری غضب ناک ہو کر پلٹا۔ میں لپک کر گلی میں آ چکا تھا۔ مجھے مسکراتے دیکھ کر بولا۔ "سوچ کر بات کر بیٹا! تو میرے گاؤں میں ہے۔ چٹنی بنوا دوں گا کھوپڑی کی۔ امداں اپنی اس ہوتی سوتی سے جا کر کہہ دے کہ وہ کبوتروں والے کھڈ کی رات بھول گئی جب میں نے ——؟"

لیکن مجھے ایک گلی میں مڑتا دیکھ کر وہ صرف کھنکار کر رہ گیا۔

من کی ڈالی

جب چڑیا نیم کی ڈالی سے اُڑ گئی تو ڈالی ڈولنے لگی اور ڈولتے ڈولتے تھم گئی۔ اپنے پتّے تھرتھرانے لگی اور نیم کے نیچے بیٹھا ہُوا تھکا ہارا مسافر سوچنے لگا کہ نیم کی ڈالی کیوں ڈولی اور ڈولتے ڈولتے کیوں تھم گئی اور اب تھم کر وہ اپنے پتّے کیوں تھرتھرا رہی ہے! سوچتے سوچتے اُس کے گرد آلود ذہن پر تیز جھونکے سے چلنے لگے اور جب گرد مُڑ گئی تو وہاں چند دھندلے دھندلے نقوش اُبھرے اور مسافر کی آنکھوں کے سامنے گزرے ہوئے زمانے کے واقعات ناٹک کی طرح آنے اور جانے لگے!

بھدّے چپل اُتار کر اُس نے ایک طرف رکھ دیئے۔ پاؤں کی اُنگلیوں کو دبایا۔ سر سے پگڑی اتار کر جھاڑی اور اُس کا تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔ نیم کے گنجان پتوں سے پرے نیلے آسمان کی کترنیں سی بکھری ہوئی تھیں اور چڑیوں کا ایک غول ان کترنوں پر سے بے شمار گیندوں کی شکل میں لڑھکتا جا رہا تھا۔

اُسے وہ دن یاد آنے لگے جب اُس کے من کی ڈالی بھی ایک چنچل سی چڑیل کے بوجھ سے کانپنے لگی تھی۔ ناجو کر وہ بچپن میں چڑیا ہی تو کہتا تھا جب وہ چرچر چوں چوں چر رچر کی آواز نکالتی تو برہان ہنستے ہنستے ریت پر لوٹ

جاتا اور پھر تالی بجا کر کہتا "اری تو تو بالکل چڑیا کی سی بولی بولتی ہے، لے ذرا پھدک نا چڑیا کی طرح"۔ اور راجو سنہری ریت پر چڑیا کی طرح پھدکنے لگتی۔ اس کی ننھی سی رنگ برنگی اوڑھنی ہوا میں پھڑپھڑاتی۔ اس کے کھلے بال اس کے شانوں پر کروٹیں سی بدلتے اور جب وہ پھدکتے پھدکتے تھک جاتی تو ریت میں گھٹنے جما کر کہتی "ہائے ری۔ میرے پر آج ٹوٹ رہے ہیں اور میرا گھونسلا ابھی کتنا دور ہے!"

"لا۔ میں تجھے اپنے پروں پر بٹھا کے لے جاؤں۔" برہان اچھل کر کہتا اور راجو کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر گول مول ٹیلوں میں بہت دیر تک دوڑتا رہتا اور جب تھک جاتا تو اسے نرم ریت پر پھینک کر کہتا "تو کتنی بھاری ہے راجو! تو نے بہت باجرہ چگ لیا ہے آج۔"

"چر چر۔ چوں چوں۔" راجو ہونٹ سکیڑ کر چرچراتی اور پھر دونوں اتنا ہنستے کہ ان کی آنکھوں سے پانی بہ نکلتا اور پیٹ میں گرہیں سی پڑ جاتیں!

— لیکن اس نے اپنے من کی ڈالی تب ڈولتی محسوس کی جب وہ امرتسر کے ہائی اسکول سے انٹرنس پاس کر کے اور تین سال تک میونسپل کمیٹی میں کلرک رہ کر استعفا دینے کے بعد گاؤں واپس آیا۔ اس کی ملازمت کے دوران میں اس کے ابا چل بسے تھے اور اب گھر سے اتنا دور بیٹھے رہنا اور پھر اتنی قلیل تنخواہ پر صابر و شاکر رہنا اسے کچھ اچھا معلوم نہ ہوا۔ اس نے مستقبل کے

بہت بڑے بڑے پروگرام بنائے۔ اپنی زمینوں پر باغ لگانے کی تجویزیں سوچیں اور کئی بار اُسے اپنے سنتروں کے بے شمار ٹوکرے ننھے سے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر ایک پہاڑی کی طرح اُبھرتے محسوس ہوئے۔ اس نے بہت سے کنوئیں کھدوانے کے لئے اچھی اچھی جگہیں انتخاب کیں اور گاؤں کے بالکل قریب ان کو کھُدوانے کی تجویز اُس نے صرف اس لئے مسترد کر دی کہ وہاں لڑکے لڑکیاں اکٹھے پانی بھریں گے اور مفت میں کوئی ہنگامہ بپا ہو جائے گا۔ خیالات کے ہجوم سے اس کا دماغ بوجھل سا ہو گیا تھا اور اس کو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی کھوپڑی میں گودے کی جگہ فولاد کے ٹکڑے کھڑکھڑا رہے ہیں!

ریتلی پگڈنڈی پر اپنا چرمی سوٹ کیس ہاتھ میں لٹکائے وہ گاؤں کے قریب پہنچا ہی تھا کہ کوئی دو کھیت اُدھر ہٹ کر ایک مینڈ پر اُسے چند بچے کھیلتے نظر آئے، برہان کو دیکھ کر انھوں نے کھیلنا چھوڑ دیا اور انگلیاں دانتوں میں دبائے ایک دوسرے کی طرف تعجب سے دیکھنے لگے اور پھر تالیاں بجاتے ہوئے مینڈ پر سے اُترے اور پرلے کھیت کی طرف جاتے ہوئے پکارے "نئے منشی جی آئے راجو بہن!ــــ ہمارے مدرسے کے نئے منشی جی آئے۔"

اور پرلے کھیت سے راجو یوں اُٹھی جیسے آسمان کے اندھیرے پس منظر

پر کوئی تارا ٹوٹے۔ برہان کی طرف دیکھ کر بولی "ارے! کیسے چلتا ہے تمھارا منشی۔ کیسے گھماتا ہے ٹانگوں کو۔ ریت سے گھبرا گیا ہے بے چارا!"

ایک لڑکا بولا "پر غریب کے ہاتھ میں صندوق ہے نا"

دُوسرا بولا "اور دُور سے آرہا ہے۔"

بُرہان یہ باتیں سُن کر ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا اور اُونچی آواز میں بولا۔

"راجو! اری شریر چڑیا۔ مجھے پہچانا تک نہیں تم نے؟"

راجو حیران ہو کر جیسے اپنے آپ سے پُوچھنے لگی "کون؟" اور پھر تیزی سے آنکھیں جھپکاتی ہنسنے لگی اور برہان کی طرف بھاگی "ارے! تم؟ بُرہان؟" — لیکن وہ برہان کے قریب آئی تو رُک گئی۔ چہرے پر شفق دوڑ گئی۔ نظریں نیچی ہو گئیں۔ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر اُس نے سر پر اوڑھنی جمائی اور گھٹی گھٹی آواز میں بولی "اچھے ہو بُرہان؟"

اور بُرہان سوچنے لگا کہ جب تارے ٹوٹتے ہیں تو ایک جگہ رُک نہیں جاتے بلکہ اپنے پیچھے لمبی لمبی لکیریں چھوڑتے لڑھکتے جاتے ہیں اور آخر اندھیروں میں گھل جاتے ہیں۔ یہ عجیب ستارہ ہے کہ ٹوٹتے ہی ایک جگہ رُک گیا اور پہلے سے زیادہ تاباں ہو گیا!

بُرہان کو چُپ چاپ کھڑے دیکھ کر راجو بلٹی اور جاتے ہوئے بولی — "بڑا دماغ ہو گیا تمھارا!"

بُرہان کو جیسے کسی نے چونکا دیا: "اری راجو! میں اچھا ہوں۔ بالکل اچھا ہوں۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ ننھی منّی چڑیل نے یہ نیا رنگ روپ کہاں سے پایا۔ تم تو خدا کی قسم پہچانی ہی نہیں جاتیں —— راجو! تم کتنی بدل گئی ہو!"

راجو رُک کر بولی "اور تم نہیں بدلے؟ یہ انگریزی بال اور یہ کوٹ۔ اور یہ اتنا خوبصورت صندوق —— اور پھر تمھاری چال کتنی بدل گئی —— اور تمھارا دماغ کتنا بدل گیا کہ میرے سوال کا جواب دینے کے لئے تمھیں اتنا سوچنا پڑا!"

بچّے اب ان کے قریب آ گئے تھے۔ ایک بولا "ارے۔ یہ تو باتیں کرنے لگے!"

• "راجو۔ تو بڑی وہ ہے!"

• "راجو! میں تیرے ابا کو بتاؤں گا۔"

• "راجو! تو مسافروں سے باتیں کرتی ہے؟"

• "تو منشی جی کو جانتی ہے راجو؟"

اور راجو بولی "اسے جانتی ہوں۔ جاؤ ڈھنڈورا پیٹ دو سارے گاؤں میں۔ بالشت بھر کے لونڈے اور ہاتھ بھر کی زبان!"

لڑکے سہم گئے۔ بُرہان نے ہنس کر جیب سے چند پیسے نکالے اور سب کو ایک ایک پیسہ دے کر بولا "لو۔ ریوڑیاں کھاؤ۔ مزے اڑاؤ اور دُعا کرو کہ

راجو کا غصہ ٹل جائے!"

بچے تو پیسے لے کر تتلیوں کی طرح وہیں پگڈنڈیوں پر اُڑتے ہوئے گاؤں کو بھاگ گئے اور راجو پلٹ کر اپنے کھیت کو جانے لگی۔

برہان جو اس عرصے میں زندگی کی کئی کٹھن منزلیں طے کر چکا تھا آگے بڑھا اور راجو کے قریب جا کر بولا "راجو! دیکھو۔ یہ ٹھیک نہیں، تم شاید مجھے اب وہ دیہاتی برہان نہیں سمجھتیں جو تمھارے ساتھ سنہری ٹیلوں پر کھیلا اور چمکتے ہوئے نیموں میں تمہارے گدگدیاں کرتا رہا۔ وہ جس نے تمہاری چاندی کی ہنسلی ٹیڑھی کر دی تھی اور تم نے غصے میں اس کا شانہ کاٹ لیا تھا۔ آج بھی تمھارے دانتوں کے گلابی گلابی نشان ہوں گے میرے کاندھے پر —— تم شاید مجھے وہ پرانا برہان نہیں سمجھتیں ورنہ تمھارا برتاؤ اتنا تلخ نہ ہوتا۔ راجو! سنتی ہو؟"

اس عرصے میں دونوں اونچی مینڈ اُتر کر کھیت میں آ گئے تھے، راجو نے گاؤں کی طرف دیکھا اور پھر برہان کے مقابل آ کر بولی "تم وہی برہان سہی۔ مگر دیکھو —— اب ہم بچے نہیں!" —— اُس کے رخساروں میں آگ سی جلنے لگی اور کنپٹیوں کے قریب نیلی نیلی سی باریک رگیں پھڑکنے لگیں!

برہان چُپ چاپ پلٹ کر پگڈنڈی پر آ گیا۔ سوٹ کیس جسے وہ وہیں چھوڑ آیا تھا ہاتھ میں لٹکا کر گاؤں کی طرف چلنے لگا۔ اس کے دماغ کی سلوٹوں میں

جلن سی پیدا ہو گئی۔ اُس کی رگوں میں جھرجھری سی دوڑ رہی تھی جیسے اس نے
بے جانے بُوجھے سانپ چھُو لیا ہو! بچپن کے واقعات سامنے بھُورے
آسمان پر اُبھر کر بہت دیر تک جمے رہے وہ سوٹ کیس کو ایک ہاتھ سے
دُوسرے ہاتھ میں بدلتا رہا اور سوچتا رہا۔ راجو کے مزاج میں اتنا ہولناک انقلاب
کیسے آیا؟ اس کھلنڈری لڑکی نے یہ زہریلی بے نیازیاں کہاں سے سیکھیں؟
اسے کس نے بتایا کہ اب وہ بچہ نہیں؟ اتنی معصوم لڑکی کو شعور و ادراک کے
سبق کس نے پڑھائے؟ —— اور جب اُسے خیال آیا کہ وہ خود بہت کچھ بدل
چکا ہے، ظاہری ہیئت کی تو بات ہی الگ ہے۔ اس کے دل کی ہر دھمک میں
کئی پریشان کُن بے یقینیاں پرفشاں ہیں۔ اس کے کانوں کے پاس اکثر
ایک آندھی سی چلتی تھی اور اس پر ہر وقت نیم خوابی کا سا عالم رہتا ہے! تو
وہ تیز تیز قدم اُٹھانے لگا۔ گاؤں والوں میں سے کئی تو اُسے پہچان گئے
لیکن اکثر اُسے مدرسے کا نیا منشی سمجھ کر آگے نکل گئے اور جب گلی کے نکڑ پہ
الغیس معلوم ہوا کہ منشی صدرالدین مرحوم کا اکلوتا لڑکا برہان امرت سر سے
نوکری چھوڑ کر گھر واپس آیا ہے تو وہ پلٹے اور اسے گلے لگا کر گھر تک
پہنچا آئے۔

دن بھر ملنے والوں اور ملنے والیوں کا تانتا بندھا رہا اور جب رات
گئے یہ شور و غوغا کم ہوا تو برہان نے ماں سے بہت بھولی بھالی باتیں کیں

"امّی! یہ بیری کا درخت وہی پُرانا ہی ہے کیا؟"

"ہاں ہاں۔ وُہی تو ہے۔"

"ٹھیک ہے" میں بھی سوچ رہا تھا کہ وہ پورب کو جھکا ہوا بھاری ٹہنا۔ یہ چھت کو چھوتی ہوئی سیدھی ٹہنیاں۔ وہ آخری پھننگ کی حیرت ناک بلندی ___ سب کچھ وُہی تو ہے۔ پر امّی! اتنا عرصہ بیت چکا ہے، اس درخت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی؟"

اُس کی ماں تعجب اور محبت سے اُس کی پیٹھ پہ ہاتھ پھیر کر بولی "کیوں نہیں آئی۔ کئی بار پُرانے پتّے جھڑے اور اُن کی جگہ نئے پتّوں نے لی۔ بور آیا۔ بیر پڑے اور پھر پتّوں سمیت جھڑ گئے۔ اِدھر اُتّر والا ٹہنا خدا بخشے تمہارے ابّا نے کاٹ کر مُرغی خانہ بنایا تھا۔ لیکن اب وہاں بھی ننّھی ننّھی ٹہنیاں اُگ آئی ہیں۔ دیکھتے نہیں؟ منڈیر پہ جھکی پڑ رہی ہیں۔"

بُرہان پھر بولا "امّی! یہ عجیب بات ہے کہ چار پانچ سال پہلے کی وہ پگڈنڈیاں جن پر میں اپنے ہمجولیوں کے ساتھ کھیلتا پھرا ویسی کی ویسی ہی ہیں۔ وُہی موڑ۔ وُہی صفائی۔ سب کچھ وہی۔ یہ پگڈنڈیاں تک نہ بدلیں جب کہ کھیتوں میں جانے کتنی بار ہل چل چکے ہوں گے!"

"ہل تو چل چکے ہیں بیٹا!" ماں بولی "مگر آخر لوگ آتے جاتے رہتے ہیں نا۔ پگڈنڈیاں پھر اُبھرتی ہیں اور پھر تم نے کبھی سیدھی پگڈنڈیاں بھی دیکھی ہیں؟

دُنیا کی سب پگڈنڈیاں ایک جیسی ہیں، مُڑتی ہوئی اور صاف اور — لیکن بُرہان بیٹا! تم بچّوں کی سی باتیں کیوں کرنے لگے؟ تم تو اب اللہ رکھے پڑھے لکھے، اتنے بڑے اور سیانے ہو چکے ہو!"

بُرہان مُسکرا کر بولا "یُونہی بچپن یاد آرہا ہے ماں! مدّت کے بعد گاؤں آیا ہوں نا۔"

اور اب بُرہان کو راجو کے بدل جانے پر اتنا تعجب نہ رہا۔ وہ سوچتا رہا کہ گو ہر چیز پر کئی انقلاب آئے ہیں اور ہر شے نے اس عرصے میں کئی چولے بدلے ہیں لیکن ہر چیز وُہی تو ہے۔ بیری نے نئی شاخیں چھوڑیں پر بیری تو وہیں موجود ہے۔ پگڈنڈیاں مٹتی رہیں لیکن پھر اُبھر کر ویسی کی ویسی نظر آتی ہیں راجو بھی بدل چکی ہے لیکن راجو تو ہے ہی! — وہی معصوم چڑیا — سُنہرے ٹیلوں کی البیلی ہرنی!!

اُس کے من کی ڈالی ہچکولے سے کھانے لگی۔ اُس نے ہزار بار چاہا کہ اس ڈالی سے یہ پھُدکتی ہوئی اور بے چین چڑیا اُڑ جائے۔ لیکن ہوا میں بالشت بھر اُبھر کر وہ پھر اسی ڈال پہ اپنے گلابی پنجے جما دیتی اور ڈالی ڈولنے لگتی اور پھر یہ ڈالی مہینوں یُونہی ڈولتی ہی رہی۔ چوپال کی محفلوں میں شریک ہونے سے وہ دیہات کے معاشی یا سیاسی سمجھ چکا تھا۔ اپنے ہم عمروں کی باتیں سُن کر، ان کے راز پا کر، ان کی کوششوں کے عجیب و غریب ذریعے

معلوم کر کے اُس نے محسوس کیا کہ وہ اب تک کورا ہی تھا۔ آخر گلیوں میں گھنٹوں دھوپ میں جلتے رہنا اور پھر راجو کو قریب سے گزرتے دیکھ کر گھبرا جانا کہاں کا مردانہ پن ہے۔ نہ بات کرنے کی جرأت نہ بلانے کی ہمت! کنوئیں پر اگر ایک بار راجو نے اس سے گاگر اٹھوائی تو کون سا میدان مار لیا اُس نے۔ آخر وہ ہر روز گاؤں کی کتنی لڑکیوں کو گاگریں اٹھواتا تھا، یہ ٹھیک نہیں!

اور پھر — ایک روز وہ شام کو ایک اندھیری اور گہری پگڈنڈی کے قریب ایک جھاڑی میں دبک کر بیٹھ گیا۔ راجو جب اپنے کھیتوں سے پلٹ کر آئی تو اس پگڈنڈی پر سے گزری۔ اُس کے سر پہ گھاس کا ایک انبار تھا اور ہونٹوں پر دھیما دھیما گیت[1]

ڈھولا چھپ چھپ بہندا ایں ہیں مے کنوں

خاموش شام کے بڑھتے ہوئے دھندلکے میں اس گیت نے مجسم صورت اختیار کر لی۔ گول مول لکیروں کی ایک گھومتی ہوئی گیند سی فضا میں چکر لیتی اُوپر لپکی اور جیسے آسمان سے ٹکرا کر تارے بن کر بکھر گئی۔

برہان جھاڑی سے کھسک کر پگڈنڈی پر آگیا اور جب راجو گنگناتی

---

[1] میرے محبوب۔ تم مجھ سے چھپے چھپے رہتے ہو

ہوئی اُس کے بالکل قریب آگئی تو وہ اچانک اُٹھ کھڑا ہوا۔ راجو گھاس کا انبار پھینکتی پلٹی اور قریب ہی کے ایک بلند ٹیلے پر تیزی سے چڑھنے لگی۔ برہان ہولے سے بولا۔ "تو تو اب بھی بالکل چڑیا کی طرح پھکتی ہے راجو!"

اور راجو ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ کافی دیر تک وہ وہیں کھڑی رہی جیسے دُھندلے آسمان پر ایک اندھیری سی پرچھائیں چپکا دی گئی ہو۔ اُس کا آنچل کبھی کبھی اُبھر کر دھیرے سے پھڑپھڑا تا تو اُسے محسوس ہوتا کہ اس بے جان ویرانے میں زندگی کی رمق باقی ہے ورنہ چار طرف ہُو کا عالم طاری تھا!

"راجو!" برہان بولا۔ "میں برہان ہوں۔"

"میں جانتی ہوں تو برہان ہے۔" راجو ٹیلے سے اُترنے لگی۔ "میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تو نے کئی بار چوپال کے بھرے مجمعوں میں میرا نام لے کر آہیں بھری ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ تو خوابوں میں بھی میرا نام بڑبڑاتا ہے لیکن دیکھ بُرہان!" اور اب وہ اُس کے بالکل قریب آگئی۔ "اب ہم بچے نہیں!"

"ٹھیک ہے۔" بُرہان بولا۔ "لیکن وہ دو بچے جو ان ٹیلوں پر برسوں اکٹھے کھیلتے پھرتے رہے ہوں، اگر کچھ عمر گزرنے کے بعد دن کو نہ سہی — رات کو سہی — ان ٹیلوں پر دو لمحے اکٹھے بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کر لیں تو ہرج ہی کیا ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" راجو بولی "لیکن میرے باپ کا کلہاڑا بہت سخت ہے۔ وہ جس شدّت سے میرے سر پر پڑے گا اُسی تیزی سے تمہاری گردن پر بھی پکے گا۔ میں جانتی ہوں تم بہت اچھّے ہو، تمہارا دل صاف ہے، تم مجھے بہت پیارے لگتے ہو اور میں بچپن کی باتیں ابھی تک نہیں بھُولی لیکن یہ چوری چھُپے کی ملاقاتیں دیہات میں نہیں پنپ سکتیں۔ یہ امرت سر نہیں۔"

بُرہان اُچھل پڑا۔ "قسم لے لو راجو! اگر میں نے امرت سر میں کسی لڑکی کو آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھا ہو۔ تم مجھ پہ شک کرتی ہو؟"

"نہیں نہیں۔" راجو بولی "ویسے میں کہہ رہی تھی کہ زمانہ بڑا نازک ہے۔"

بُرہان ہمّت کر کے بولا "لیکن کیا میں تمہارے باپ کو کہہ کر۔"

لیکن راجو نے اُس کی بات کاٹ لی "تم کہیں نوکر بھی تو نہیں۔ میرا باپ کھاتا پیتا گھر ڈھونڈے گا میرے لئے۔ وہ مجھے تمہارے پلّے باندھنے سے رہا۔"

اور بُرہان بچّوں کے سے بھول پن سے بولا "لیکن میں زمینوں پہ باغ لگانے والا ہوں اور بہت سے کنوئیں کھُدوانے والا ہوں۔"

راجو جھُک کر گھاس کے انبار سے ایک تنکا نکال کر بولی "لگانے والوں اور کھُدوانے والوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ یہ کل کی باتیں ہیں۔"

"کوشش کروں؟" بُرہان نے انتہائی بے بسی سے پوچھا۔

"ہاں۔ کر دیکھو — ذرا یہ گٹھا میرے سر پر رکھ دو۔"
برہان نے سعادت مند بچے کی طرح حکم کی تعمیل کی اور پھر رُکتے رُکتے بولا: "اچھا تو پھر —"

"ہاں ہاں۔ کوشش کر دیکھو۔"

اندھیری رات کی وسعتیں سمٹ کر ایک غار میں تبدیل ہو گئیں اور برہان دیر تک اُس کی گہرائیوں میں ٹامک ٹوئیے مارتا پھرا۔ جب وہ گھر کو پلٹا تو اس کی ماں اندر صحن میں پڑوسن سے باتیں کر رہی تھی۔

"بات تو ٹھیک ہے۔ پر بہن! وہ نوکر جو نہیں۔ کہیں نوکر ہوتا تو سارا گاؤں رشتے کے لئے میرے گھر پر ٹوٹ پڑتا۔ یہ امرت سر تھا تو لگی آئے پر میں نے سیدھے منہ سے بات نہ کی — اب کوئی پوچھتا ہی نہیں۔"

پڑوسن کی آواز آئی: "پر تو نے اپنے لاڈلے کو نوکری ڈھونڈنے کے لئے کبھی کہا بھی ہے؟"

"نہیں بہن! کبھی نہیں کہا اور نہ کبھی کہوں گی۔ سمجھے گا ماں تھک گئی ہے اُس سے۔ خود سیانا ہے کبھی محسوس کرے گا۔ اور پھر ابھی بیس سال تو اس کی عمر ہے اور آج کل شادیاں تیس تیس کے بعد ہو رہی ہیں۔"

برہان وہیں سے پلٹا۔ اندھیری گلیوں میں سلسلئے کی طرح رینگتا گاؤں سے باہر آیا اور ایک سمت منہ اٹھا کر چل دیا اور سوچتا گیا، کبھی تو ختم ہو گی یہ راہ۔

کبھی تو اس راہ میں کوئی شہر حائل ہوگا اور وہ پھر کسی میونسپل کمیٹی کے دفتر کا دروازہ کھٹکھٹائے گا اور پھر جب وہ نوکر ہو جائے گا — جب وہ نوکر ہو جائے گا — جب وہ — !"

اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔ خیالات کی دھکا پیل سے اس کا دماغ چکرانے لگا اور دن چڑھے جب وہ تھک ہار کر ایک نیم کے سائے میں بیٹھ گیا تو اچانک نیم کی ایک ڈالی چڑیا کے اُڑ جانے سے ڈول اٹھی۔ وہ دھندلی سوچوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا اور جب وہ اپنے نوکر ہو جانے کے بعد کے حالات پہ غور کرنے لگا تو وہ بھڑک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ پریشانی میں اس نے اپنے سینے کو زور سے مَلا اور اس نے محسوس کیا کہ گو اس کے من کی ڈالی اب ڈولتے ڈولتے تھم کر اپنے پتّے تھرتھرا رہی ہے لیکن اب اس پہ وہ کنکانی پنجوں والی پھدکتی ہوئی بے چین چڑیا موجود نہیں بلکہ اس پہ میونسپل کمیٹی کا دفتر سوار ہے!

نیم وا دریچے

— اُسے دیکھنے والے کہتے "پر یہ وکیل کیسے بنا؟ وکیلوں والی تو کوئی بات نہیں اس میں — اس کی ہر بات رس بھرا شعر ہے، اس کی ہر حرکت میں غنودگی ہے، اس کی آنکھوں سے ہمیشہ خواب سے جھانکتے رہتے ہیں، اتنے ہلکے پھلکے مزاج کا نوجوان تعزیراتِ ہند کے خار زار میں کیسے اُلجھا؟ بھئی یہ کوئی راز کی بات ہے!"

کہنے والے سچ کہتے تھے۔ وکالت کا پیشہ اختیار کرنے میں اس کا ایک راز پوشیدہ تھا۔ جب وہ اپنے دفتر کی کرسی پر بیٹھ کر اخبار کی آڑ سے سامنے سڑک پر پریشان حال دہقانوں کو اپنی طرف آتا دیکھتا تو اس کی بصارت اس کی آنکھوں میں ریت کے موٹے موٹے ذرّے بن کر چبھنے لگتی اور اس کے ہونٹوں پر باریک سی شکنیں اُبھر آتیں جو کچھ دیر کے بعد بھوری پپڑیاں بن جاتیں۔

اس کا منشی کان پر پنسل رکھے، عینک کو ناک کے سرے پر جمائے ہوئے ہانپتے پر اٹکائے اندر آتا، اور کہتا "قتل کا کیس ہے محمود صاحب!" — دفعہ ۳۰۲ کے موٹے موٹے حروف سامنے دیوار پر اُبھر آتے لیکن جب اسے معلوم ہوتا کہ اس قتل میں زن کی بجائے زر اور زمین کا ہاتھ ہے، تو وہ اخبار کو

مروڑکر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا اور نیلی روشنائی کے قلم کو لال روشنائی میں ڈبو کر فائلوں کی جلدوں پر بے ڈھنگے دستخط کرنے لگتا۔

منشی عینک اُٹھا کر ناک کے بانسے کو رگڑتا اور پنسل کو ایک کان سے دوسرے کان پر جماتے ہوئے کہتا "محمود صاحب! اتنے اچھے کیس لے آتا ہوں میں۔ مگر آپ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ پانسو روپیہ فیس بھی چکالی ہے دن دہاڑے کا قتل ہے صاحب! سارا گاؤں دیکھنے والا۔ ملزم موقع پر گرفتار۔ کلہاڑا ہاتھ میں۔ کپڑے خون میں تر۔ اور پھر پہلی پیشی میں مجسٹریٹ کے سامنے اقبالی ہو گیا کم بخت۔ اُس کا باپ تو اپنی ساری پونجی بیچ کر بھی مقدمہ لڑے گا!"

لیکن محمود کے لئے روپیوں کا لالچ فروعی حیثیت رکھتا تھا۔ اُس کے پاس روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ اُسے آرزو تھی تو محض زندگی کے ایک خواب کی تعبیر کی — ایک دلآویز خواب جو گہرے مطالعہ کا نتیجہ تھا اور جس نے اُس کے دنوں پر سائے اور راتوں پر کرنوں کے تار سے پھیلا رکھے تھے!

کتابوں میں اُس نے پڑھا تھا کہ دیہاتی لڑکیوں کے حُسن میں ابھی تک یونانی تصور کی وہ رمق باقی تھی، جس نے دیوتاؤں کے دماغ مختل کر دیئے اور زندگی کے کڑے سے کڑے قانون محض اُس حُسن کی ہم نشینی کے لئے توڑ پھوڑ ڈالے گئے۔ وہ شہروں سے بیزار تھا۔ یہاں کی سڑکیں تک بھی تو

مصنوعی تھیں۔ کنکریاں بچھاؤ۔ انجن چلاؤ۔ تارکول کا تعفن پھیلاؤ اور مقدس دھرتی کے جسم پر بدنما خراشیں ڈال دو۔ یہ بڑے بڑے ہوٹلوں کے دبیز پردوں کے پیچھے ریڈیو کی مدھم آوازیں۔ گھبرائے ہوئے قہقہے اور پُراسرار کھسر پھسر۔ سائنس کے ایجاد کردہ آلات سے سلجھی ہوئی پلکیں جو دیر تک جھکے رہنے کے جادو سے ناآشنا تھیں۔ یہ گرجتے ہوئے بازار اور یہ بھبکتی ہوئی دکانیں! — یہاں زندگی دیوانی ہو رہی تھی!

اور وہاں — دیہات میں — اُس کے محبوب مصنفین کے قول کے مطابق — زندگی ازلی و ابدی شگفتگی کی جھلکیاں لئے ہوئے تھی۔ وہاں کے لالہ زاروں کے مالی کا کام خود فطرت نے سنبھال رکھا تھا۔ وہاں حُسن سادہ اور معصوم تھا۔ وہاں کی معاشرت میں ریشم کا سا لوچ اور نرمی تھی۔ وہاں کی لڑکیاں بے دریغ مسکراہٹیں بکھیرنے میں بخل سے کام نہیں لیتی تھیں۔ اُن کی جھکی ہوئی پلکوں کی اوٹ میں بے داغ گیتوں کے ہجوم تھے۔ کیونکہ اُونچی چوٹیوں پر صنوبروں کے تلے اور نیچے میدانوں میں کیکروں کی چھدری چھاؤں میں اُنھوں نے چرخے کاتے اور دودھ بلوئے تھے۔ فطرت کی ہم نشینی نے اُنھیں سادہ اور پاک بنا دیا تھا۔

طالب علمی کے زمانے سے وہ دیہاتوں کی اُن پُراسرار رنگینیوں سے فیض یاب ہونا چاہتا تھا، جن کے تذکرے کرتے ہوئے بڑے بڑے اہلِ قلم

فصاحت کے دریا بہا دیتے تھے۔ وکالت کا پیشہ اُس نے اسی لئے اختیار کیا تھا لیکن اُس کے ہاں دیہاتی آئے مگر دیہاتنیں نہ آئیں۔ ایک بار ایک بڑھیا لاٹھی ٹیکتی اُس کے دفتر کے قریب سے گزری۔ وہ اندھی تھی اور اس کا ہاتھ ایک نوخیز لڑکی نے تھام رکھا تھا جو کسی کی طرف دیکھتے ہوئے جھجکتی تھی اور جھجکتے ہوئے ہر کسی کو دیکھ لیتی تھی۔ اُس کے جی میں آئی کہ بڑھ کر لڑکی سے کہے "چھوکری! تُو دکھیا معلوم ہوتی ہے مجھے۔ اگر تجھ پر ظلم ہوا ہے اور تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہتی ہے تو اِدھر آ۔ میں تیرا کام دام لئے بغیر کر دوں گا۔ تیرا فرض بس اتنا ہو گا کہ تُو سارا واقعہ مجھے سُنا دے ــــ اور پھر مسکرا دے ــــ اور پھر اپنے میلے دوپٹے سے اُلجھے ہوئے بال چھپاتے ہوئے مجھے صرف اتنا کہہ دے "وکیل میاں! تُو بڑا دوہے!"

وہ دروازے تک آیا بھی، لیکن اچانک اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہوا میں لٹک گیا ہے، وہ دونوں بھکارنیں تھیں اور شام کے کھانے کے لئے ایک آوارہ نوجوان کے آگے ہاتھ پھیلائے کھڑی تھیں "بابو۔ ایک پیسہ دے بانکے بابو۔ اللہ تو سہرا یا ناتھے!"

"اور تو گھونگھٹ نکالے" آوارہ نوجوان پان کی پیک کو نچلے جبڑے میں سنبھالتے ہوئے بولا "تُو مہندی رچائے اور بڑھیا ڈھولک بجائے اس سنجوگ پر!"

"اللہ مارا۔" لڑکی بولی۔

"خدائی خوار۔" بڑھیا بڑبڑائی۔

اور آوارہ نوجوان بیڑی سلگاتا محمود کے سامنے سے ایک گیت گاتا گزرا۔

چھوڑو جی۔ بتیاں چھچھوری کرت ہو
پگلے ہو، کیوں جوراجوری کرت ہو
مٹھے میں مُنوا کی چوری کرت ہو

مان بھی جاؤ جی۔ ہٹ نہ دکھاؤ جی
من کلپت ہے۔ دھیر بندھاؤ جی
آؤ جی۔ آؤ جی

اور اُس نے پھیپھڑوں کے پورے پھیلاؤ سے کام لے کر ایک بھونڈا کھڑکھڑاتا نعرہ لگایا۔ "آؤ جی!"

قریب کے ایک بالاخانے کی کھڑکی پٹ سے کھلی اور کھٹ سے بند ہو گئی اور ایک باریک سا قہقہہ سنگین دیواروں سے سر پٹختا، روشن دانوں سے کھسک کر محمود کے کانوں کے قریب غضب ناک بھڑ کی طرح بھنبھنانے لگا۔

اُسی روز اُس نے قریب کے ایک پہاڑی گاؤں میں جانے کا تہیہ کر لیا۔

منشی نے جب یہ سنا تو اُس کی عینک ناک کے بانسے سے لٹک کر بھوری

مونچھوں پر اٹک گئی۔ آنکھوں پر پپوٹے جھک آئے۔ بھنویں بل کھا گئیں۔ قلم کے اُلٹے سرے کو دوات میں ڈبو کر بولا۔ "اور میں محمود صاحب!؟"

"تمھیں ہر مہینے باقاعدہ تنخواہ ملتی رہے گی۔" محمود بولا۔

اور منشی کی آنکھیں کھل گئیں۔ بھویں تن گئیں اور عینک اُچک کر ناک کے بانسے پر ہو بیٹھی۔ ہونٹ لرزنے لگے جیسے کہہ رہا ہو۔ "کسی نیک کام کا پھل ہے یہ۔ ورنہ بغیر کام دام کون دے گا اس گئے گزرے زمانے میں اور محمود صاحب! تم کہیں نکل جاؤ، ابری بابا سے۔ پر یہاں نقد سودا چلتا ہے۔ تم تنخواہ نہیں دو گے تو پنڈت لکھمی رام پلیڈر تو کہیں نہیں گئے۔ جو ایک برس سے تجربہ کار منشی کی تلاش میں ہیں!"

سیدھا سادا شہری لباس پہنے ہاتھ میں چمڑے کا ایک بیگ لٹکائے وہ سٹیشن پر آیا اور کسی غیر معروف مقام کا ٹکٹ خریدا کر تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھ گیا۔

اس ڈبے کے مسافر ہندوستان کے تمام صوبوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ مگر اکثریت اُن دیہاتیوں کی تھی جو محمود کے خوابوں کے بھولے بھالے کردار تھے اور جن میں ابھی تک ازل میں بخشی ہوئی زندگی کی دھندلی سی جھلکیاں پائی جاتی تھیں۔ مسافروں سے گھل مل کر بیٹھنے کی تمہید خوش مذاقی ہے۔ یہ مقولہ اس نے کسی کتاب میں پڑھا تھا۔ اس لئے وہ آس پاس دیکھنے لگا۔ ایک بنگالی کی

عینک کے سُنہرے فریم پر ایک مکھی بار بار بیٹھتی تھی اور وہ جھلّا کر بار بار اپنا ہاتھ جھٹکتا تھا۔ محمود آگے جُھک کر بولا "مکھی آپ کو تنگ کر رہی ہے؟"

"ہُم۔" بنگالی نے اُمرت بازار پتریکا میں اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کی۔

"مٹھاس پر بیٹھتی ہے مکھی۔" محمود بولا۔

"ہُم" بنگالی نے اخبار کا زاویہ اور بلند کر لیا۔

"رَس گلّے کھائے ہوں گے آپ نے؟" محمود خوش مذاقی پر تُل گیا تھا۔

"ہُم — ہیں؟" بنگالی بھڑک اُٹھا "رس گلے؟ اِدرکا رَس گلا اُدر کے رَس گلّے کا بچہ ہے۔ اُدر کا رس گلا یہ یہ ہوتا ہے" — اور اُس نے پہلو سے سنترہ اُٹھا کر اُنگلیوں میں گھُما یا۔

"اور اِدر کا رس گلّا؟" محمود نے پُوچھا۔

"اِدر کا!" بنگالی سوچ میں پڑ گیا "اِدر کا رس گلا — اِدر کا بَس آپ کی ناک ماپھق ہوتا ہے!"

آس پاس بیٹھے ہُوئے مسافر کھِلکھلا قہقہے لگانے لگے۔ سب کے سب اُس کی اچھی بھلی ناک کو گھورنے لگے جس میں شرارت بھری نظریں برسے

کی طرح گھسی جا رہی تھیں۔

اُس طرف سے ایک دیہاتی طنزاً کھنکارا۔ "اُہم" اور پھر محمود کے قریب آکر بولا "اِس لفچی میں کیا ہے میاں؟"

"کیوں؟" محمود سٹپٹا گیا۔

دہقان اپنے ساتھیوں کو گوشۂ چشم سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ لفچی کھولو نا میاں! دوا دارو کو یوں بغل میں دبائے پھرنا بھلے آدمیوں کی ریت نہیں۔ ایسی لفچی حکیم ہی تو رکھتے ہیں اپنے پاس۔"

ایک سرحدی پٹھان آخری اُنگلی میں سگریٹ اٹکا کر اور ایک ہولناک کش لگا کر بولا "یا نائی!"

قریب ہی ایک پُوربیا گودی سے چلّو پر پانی ڈالتے ہوئے بولا۔

"یا بنجارے!"

پرلی سیٹ پر دبکی ہوئی دیہاتنیں آنچلوں میں ناکیں چھپا کر کھلکنے لگیں اور محمود گھبرا کر بولا "بھئی! نہ میں حکیم ہوں نہ نائی ہوں نہ بنجارا۔ سیر پہ نکلا ہوں گھر سے۔ اس بیگ میں چند کپڑے اور کیمرہ ہے۔ میں وکیل ہوں۔"

"وکیل ہیں آپ؟" عقب سے کسی نے محمود کی گردن کو چھوا۔ محمود نے پلٹ کر دیکھا تو ایک لالہ جی آنکھیں پھاڑے اُسے گھور رہے تھے۔

"معاف کرنا جی۔ آپ وکیل ہیں نا؟ ایک بات پوچھنی ہے آپ سے۔" اگر

ایک شخص ایک دوسرے شخص سے قرضہ لے اور رسید لکھ کر نہ دے اور پھر قرضہ چکانے سے انکار کر دے تو قرضہ دینے والا شخص کیا کرے؟"

"چلو بھر پانی میں ڈوب مرے!" محمود بیگ سنبھالتے ہوئے بولا۔ اٹھ کر ایک کونے میں جا بیٹھا اور سوچنے لگا۔ یہ حقے گڑگڑاتے، باچھیں کھڑکھڑاتے قہقہے لگاتے پنجابی دہقان شاید اُن مصنفوں نے نہیں دیکھے جنھیں ان کے دلوں کے بلور پر کوئی دھبہ نظر نہ آیا۔ مگر ہو سکتا ہے یہ دیہاتی نہ ہوں قصباتی ہوں۔ اور پھر قصبوں میں ریلیں نہ سہی وہ لاریاں تو پہنچ ہی چکیں ہیں جن کے عقب میں زندگی کی پاکیزگی چیختی چلاتی گھسٹتی رہ جاتی ہے!

جوں توں کر کے وقت کٹا۔ سٹیشن پہاڑ کے دامن میں تھا۔ پلیٹ فارم سے باہر آیا۔ چند پگڈنڈیاں اِدھر اُدھر لپکتی لپکتی پہاڑوں کی بھوری وسعتوں میں گھل گئی تھیں! گاڑی دھوئیں کی پھیکی پھیکی لکیر چھوڑتی افق پر سمٹتی جا رہی تھی اور سٹیشن کے بنگلے کے سرے پر لکڑی کے تختے کا سہارا لئے بابو ٹکٹ گن رہا تھا۔ کسی اچھے سے گاؤں کا پتہ پوچھنے کے لئے محمود بابو کی طرف بڑھا۔ بیگ کی چرر چرر سے بابو چونکا تو محمود بولا "بابو جی! معاف کیجئے گا آپ مصروف تھے، مجھے کسی ایسے گاؤں کی راہ بتلایئے جو نزدیک بھی ہو، اچھی جگہ پر بھی ہو، گاؤں کی ساری خصوصیات بھی موجود ہوں۔ میں اجنبی ہوں سیر پہ نکلا ہوں گھر سے۔ اور پھر مجھے کسی خاص گاؤں میں تو جانا نہیں۔ بس

کوئی اچھا سا پیارا سا گاؤں ہو!"

بابو گھوم کر محمود کے قریب آ گیا۔ بولا "آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی!"

محمود مسکرایا "بات یہ ہے بابو جی! کہ میں سیر پر نکلا ہوں۔ مجھے کسی ایسے گاؤں کا پتہ بتائیے جس میں پنگھٹ ہوں، نیموں کے جھنڈ ہوں، لہلہاتے کھیت ہوں، بھدّی منڈیریں اور آڑی ترچھی گلیاں ہوں، جہاں کی چوپالیں آدھی آدھی رات تک قہقہوں سے گونجتی رہیں، جہاں کی مسجدوں میں سیدھے سادے نمازی اور جہاں کے مندروں میں بھولے بھالے پجاری ہوں، جہاں کی لڑکیاں کھلے آنگنوں میں رنگین چرخے کاتیں اور نیم اندھیرے کنوؤں میں بینگیں بڑھاتے ہوئے رسیلے گیت گائیں، جہاں —" محمود بے خود سا ہو گیا۔

بابو محمود کی بات کاٹ کر بولا "معاف کیجئے گا۔ آپ بات کر رہے تھے، دُور دُور تک گاؤں بکھرے ہوئے ہیں ان پہاڑوں میں۔ نزدیک کے گاؤں بتائے دیتا ہوں۔ یہ پگڈنڈی سیدھی کنڈہ کو جاتی ہے۔ اُس کمان سی پگڈنڈی پر جوتہ ہے۔ اس سامنے والی پگڈنڈی پر آپ کو کٹھوا ہی ملے گی۔ دو درختوں کے درمیان پتلی سی راہ — وہ جس کے آس پاس گائیں چر رہی ہیں — یہ مہندی پور جاتی ہے اور —"

محمود جھٹ بول اُٹھا "مہنداری پور؟ معاف کیجئے گا۔ آپ بات کر رہے تھے، مہندری پور ٹھیک رہے گا۔" اور مہنداری کی خوشبو میں لپٹے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "پلٹنے پر ملاقات ہو گی آپ سے!"

بابو مسکرایا جیسے کہہ رہا ہے "تو کیا پلئے گا مہندی پور میں۔ نہ وہاں لارنس باغ، نہ ٹھنڈی سڑک، نہ شملہ پہاڑی۔ اور تیری چال ڈھال تیا رہی ہے کہ تو پتھریلی گلیوں کے کنارے اُپلے گھروندوں کا سہارا لے کر بیٹھنے والے دیہاتیوں سے —— خیر!" وہ ٹکٹ گننے لگا۔

مہندی پور ننھا سا گاؤں تھا۔ گارے میں جکڑے ہوئے گول مول پتھروں کے ذوزنقہ کی شکل کے گھروندے، کنکروں سے پٹی ہوئی گلیاں، میلے کھدر کے لباس پہنے ہوئے کڑیل گبرو، اور سر پہ گاگروں کی قطار جمائے ہوئے ملبے ملبے ڈگ بھرتی پنہاریاں۔ جن کی گوری کلائیوں کو چیت کی چوڑیوں نے میلا کر دیا تھا۔ گاؤں سے پورب کی طرف ایک گھاٹی پر ننھا سا جھرنا۔ جس کا پانی ٹخنوں ٹخنوں تھا۔ گاہے ماہے کہیں الغوزے بجتے، کبھی کبھی کسی دور افتادہ چوٹی سے کسی دوہے کی بھنک پڑ جاتی، ورنہ ہر طرف سکوت طاری تھا جس کو بھیڑوں کے ڈکرانے اور بوڑھوں کی کھانسی کی ٹھسوں ٹھسوں نے زیادہ شدید کر دیا تھا۔

محمود گاؤں میں داخل ہوا۔ تو کھویا کھویا۔ ایک گبرو سے چوپال کا پتہ

پُوچھا۔ تو جواب ملا "چوپال بند ہے آج کل۔ نمبردار جی کی سالی مر گئی ہے۔ اور کوئی دوسری چوپال یہاں ملنے کی نہیں۔ بالشت بھر کا تو گاؤں ہے۔ تُو مسافر لگتا ہے مجھے۔ سامنے مسجد میں پڑ رہ۔"

"مگر اس کے مینار؟" محمود کے دماغ پر لاہور کی شاہی مسجد سوار تھی!

"مینار کے بغیر بھی یہ مسجد ہی ہے۔ مسجد کی پہچان مینار نہیں، محراب ہے۔" گبرو مُسکرایا۔

محمود مسجد میں آیا۔ صحن کے باہر ایک کھاٹ پر بیٹھ کر بیگ سے کپڑے نکالے۔ وضو کیا اور نماز پڑھنے لگا۔ بڑا لطف آیا اُسے نماز میں، کیونکہ قریب ہی ڈھول اور شہنائیاں بج رہی تھیں۔ اور ڈھول اور شہنائیاں بیاہ کی نشانیاں ہیں اور پنجابی دیہات کے بیاہ اپنی خصوصیات کے لئے منفرد ہیں! ایک بار پہلو کی گلی میں چند پنہاریاں جاتی نظر آئیں۔ موٹی موٹی ضخیم کتابوں کی تفسیریں اب اُس کے سامنے گھومتی پھر رہی تھیں۔ لیکن مسجد کا احترام لازم تھا۔ کنکھیوں سے اُس نے کچھ دیکھنے کی کوشش بھی کی، مگر پنہاریاں تیز گام ہوتی ہیں۔ گاؤں کی گلیاں یکلخت ایک طرف مڑ جاتی ہیں اور پھر کنکھیوں سے دیکھنا بھی تو دیکھنے کا مُنہ چڑانا ہے!

دُعا سے فارغ ہوا تو امام صاحب کے قریب کھسک آیا، اور بولا "اجازت

ہو تو کچھ عرض کر دوں ؟"

"کہو کہو" امام صاحب تسبیح کے دانوں کی گنتی جاری رکھتے ہوئے بولے "شہری معلوم ہوتے ہو؟"

"جی شہری ہوں۔ دیہات کی معاشرت کے متعلق ایک کتاب لکھنے والا ہوں، مہندی پور بڑا پیارا گاؤں ہے، یہاں کے لوگوں کی سادگی اور شرافت کے چرچے سُن کر مناسب سمجھا، کہ اپنا دلچسپ سفر یہیں سے شروع کروں۔ آپ یہیں کے رہنے والے ہیں نا؟"

امام صاحب مسکرا کر بولے "نہیں۔ میں ہری پور ہزارہ کا پٹھان ہوں، پندرہ برس سے رہتا ہوں اس گاؤں میں، خدمت کرتا ہوں بھولے دہقانوں کی۔"

محمود مہندی پور اور ہری پور کی ٹکّر سے جھینپ سا گیا۔ بولا "پندرہ برس سے؟ تو یہ کہیئے نا کہ آپ کی جائے پیدائش ہری پور ہے لیکن آپ رہنے والے مہندی پور کے ہیں۔ — تو حضرت! میں یہ کہنا چاہتا تھا، کہ کیا میں چند روز یہاں حجرے میں رہ سکتا ہوں؟"

امام صاحب کی تسبیح کی روانی رُک گئی۔ "لاحول ولاقوۃ۔ سیاح لوگ مسجد کے حجروں میں کیسے رہ سکتے ہیں؟ یہ دیسی طلبہ کے لیئے بنا رکھے ہیں یہ گھروندے۔"

"تو میں آپ سے کریما کے سبق لے لیا کروں گا۔" محمود جھٹ بول اٹھا
اور پھر جب امام صاحب کو معلوم ہوا کہ محمود کھاتا پیتا نوجوان ہے
تو گھر سے اُس کے لیئے توشک اور تکیہ لے آئے، اور نمازیوں میں مشہور
کر دیا کہ یہ گبرو بڑا اللہ والا ہے، لکھدتی ہے پر علمِ دین حاصل کرنے کے لیئے
سُوکھے ٹکڑے قبول کر لیئے تمھارے۔ یقیناً" اسلام پھر کروٹ بدل رہا ہے!"
نمازی محمود کی اَدھ کتری مونچھوں کے آخری مصنوعی خم کو دیکھ کر پہلو بدلنے
لگے اور پھر جیسے دامن چھڑانے کے لیئے بولے "اچھی بات ہے، اچھی بات
ہے"۔ اور پھر ایک طرف ہٹ کر سرگوشیاں کرنے لگے" یہ یہ فرنگیوں کے
سے رنگ ڈھنگ، یہ کہنیوں تک آستینیں، یہ کانوں کی لوؤں تک بالوں
کے گچھے۔ یوں بات کرتا ہے جیسے تحصیلدار ہے عدالت میں بیٹھا ہوا۔ یہ
کریما پڑھے تو میرا نام بدل دینا۔ شیر جنگ کی جگہ جھنگڑا کہہ دینا"۔
"خفیہ پولس۔" طوطے کی چونچ ایسی ناک والا ایک بوڑھا نسوار کی ڈبیا
کو چٹکی سے بجاتے ہوئے بولا" سمجھے؟ خفیہ پولس۔ مولبی کے کان نہ کاٹ
لے جائے تو جو جی میں آئے کہنا۔"
لیکن محمود ان سرگوشیوں سے بے خبر اپنے حجرے میں بیٹھا کیمرے کو
صاف کرتا رہا اور پھر اُسے بغل میں لٹکاتا مسجد کی سیڑھیاں اُترا۔ پاس ہی سے
ایک لڑکا گزر رہا تھا۔ اُس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر پوچھا" شادی والا کدھر ہے۔

میاں صاحبزادے ؟"

"میں صاحبزادہ نہیں۔" لڑکا بولا "میں تو بکھے چمار کا لڑکا ہوں۔ ہاں۔"

"پر شادی والا گھر کدھر ہے بکھے چمار کے لڑکے ؟" محمود دیہاتی بولی سے اپنا نفسیاتی کھیل شروع کر رہا تھا۔

لڑکا بولا "پُوربی محلّے کی بڑی گلی میں۔" اور پھر ناچتا کودتا ایک طرف نکل گیا اور چیخنے لگا "کل بازار لگے گا بڑی گلی میں۔ بنجارا آیا ہے۔ پٹاخے اور سُرمہ اور پھنجھیریاں خریدیں گے ہم۔"

محمود گھبرایا ضرور مگر اس غلط فہمی کو بیچارے بچے کی نادانی پر محمول کر کے شادی والے گھر کی تلاش میں چل کھڑا ہوا اور جب ڈھول کی آواز کو ٹٹولتا وہ ایک گلی کا کافی حصّہ طے کر لیتا تو سامنے رستہ بند ہو جاتا اور وہ مڑتا پھر تا پھر مسجد کے قریب آ نکلتا۔ کہیں کہیں کتّے اُس پر جھپٹتے۔ کتّوں کو بھونکتا سُن کر باڑوں میں بکریاں اور بھیڑیں ممیاتیں اور چھتوں پر بیٹھی ہوئی عورتوں کی گودیوں میں سوئے ہوئے بچے چونک کر بلبلا اُٹھتے۔ آخر جب وہ شادی والے گھر کے قریب پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ یہاں لڑکیاں الگ گاتی ہیں اور لڑکے الگ۔ یہاں دِلّی پار والی رسمیں نہیں چلتیں۔

محمود نے سوچا "مگر دیہاتی فلموں میں تو میں نے کئی مرتبہ لڑکے لڑکیوں کو اکٹھے ناچتے گاتے دیکھا ہے۔ یہ عجیب گاؤں ہے۔ کہیں میں پاکستان میں تو

نہیں آگیا!"

لیکن یہ یاغستان نہیں تھا۔ پنجاب کا ننھا منا سا گاؤں تھا، جہاں حسن و عشق کو کھل کھیلنے کے ڈھب نہیں آتے!

بے شمار لڑکیوں کی پتلی پتلی آوازوں کی حیرت انگیز ہم آہنگی سے وہ لذت یاب ضرور ہوا۔ اس کے کانوں میں روشن ستاروں، پیلے چاند، اُودے آسمان، سرمئی آنکھوں، طلائی بالوں اور رس بھرے ہونٹوں کی جھنک پڑتی رہی۔ اُس نے شہروں کے متعلق بھی ایک گیت سُنا، جس کا مفہوم یہ تھا کہ "میرے محبوب! شہر کی طرف مزدوری پہ نہ جائیو، کیونکہ وہاں بے رحم ریلیں اور اندھی لاریاں ہیں، وہاں کچہریاں اور جیل خانے ہیں، اور یہاں مہندی پور میں نرم رَو چھکڑے اور برق رفتار گھوڑیاں ہیں۔ لہلہاتے کھیت اور پُر امن چوپالیں ہیں۔ مزدوری کے لئے شہروں کی طرف نہ جائیو میرے محبوب!"
—— گیتوں کی اس پھلواری سے یہ گرد آلود گری پڑی کلیاں چُن کر وہ واپس آیا اور چوپال پر جا نکلا!

اُس نے کوشش کی کہ لوگ اُس کی طرف حیرت سے دیکھنے کے بجائے اُس سے سیاسیات کی موجودہ تحریکات، ادبیات کے موجودہ رجحانات اور مذہب کے موجودہ میلانات کے متعلق سوال کریں مگر وہ اپنے محبوب موضوع چھیڑے بیٹھے تھے۔ "برساتی نالے کے پانی کا رُخ بدلنے کی ایک ہی کہی۔ میں نے تو

ذرا سا ڈھلوان بنا دیا ہے پگڈنڈی کو۔ منوں پانی تیرے کھیت میں جائے گا تو چلو پھر اِدھر بھی آ نکلے گا۔ اللہ کی دی ہوئی نعمت پر کسی کا اجارہ تھوڑا ہے"
—— بات کرو پچھمی گھٹاؤں کی، جو برستی ہیں تو جل تھل ایک کر دیتی ہیں۔ پوربی گھٹاؤں پہ تو اللہ کی مار ہے۔ گرجتی دھاڑتی اُبھرتی ہیں، اور ہوا میں اُڑتے ہوئے کبوتروں کی سی دو چار بٹیں پھینکتی گھل جاتی ہیں آسمانوں میں —— میں نے تو کبھی پوربی گھٹا کو برستے نہ دیکھا" —— "میں نے دیکھا تھا لاہور میں" —— "لاہور میں"؟ ارے پگلے بابُزرگوں کے مُنہ آتا ہے؟ لاہور میں تو پچھم پورب ہو جاتا ہے اور پورب پچھم!" —— بلند قہقہوں میں محمود نے بھی حصہ لیا مگر یونہی بے تحاشا۔ بے ڈھنگے اور مصنوعی انداز میں —— جیسے اپنے پیٹ میں خود ہی گدگدیاں کر رہا ہے! —— دیر تک کسی موقع کے انتظار میں رہا مگر سوشلزم کی اصطلاحات کو چباتا رہ گیا۔

حجرے سے باہر کھاٹ پہ لیٹا تو کھویا کھویا۔ تھکا ہارا تو تھا ہی، نیند آ گئی اور جب صبح کو اُٹھا تو کیمرہ بغل میں لٹکاتا پنگھٹ پہ جا نکلا مگر ایک پہار سے یہ انکشاف سُن کر بھونچکا سا رہ گیا کہ مردوں کے لئے پنگھٹ کا پرلا کنارہ مقرر ہے۔ اِدھر لڑکیوں کے آس پاس کوئی چھوکرا گھومتا نظر آئے تو پنچایت اُلٹا لٹکا دے کسی درخت سے!

کیمرے کے نرم چمڑے پر ہاتھ پھیرتا واپس آیا۔ رستے میں ایک لوہار

کی دُکان پڑتی تھی۔ بوڑھا لوہار بھٹی میں لوہا گرم کر کے اَہرنی پر رکھ رہا تھا اور آس پاس بیٹھے ہوئے دہقانوں سے کہہ رہا تھا۔ "لو بھئی اٹھاؤ ہتھوڑا۔ بھولو تو تم کتنے پانی میں ہو، سیدھی اور جمی ہوئی ضرب لگانا۔ کلہاڑے کا پھل ہے، چپٹا ہونا چاہئے۔ گولائی ہوئی ذرا سی تو چودھری سر پھوڑ ڈالے گا" ـــــ ٹھکا ٹھک ہتھوڑے پڑنے لگے۔ اہرنی پر دہکتا ہوا لوہا کروٹیں بدلنے لگا۔ اچانک محمود آگے لپکا اور بولا۔ "بھئی! ہتھوڑا دینا مجھے، میں بھی تو دیکھوں ذرا۔" ـــــ ہتھوڑا تھام کر اوپر اُٹھایا تو ڈگمگا گیا۔ قدم جمائے تو ہتھوڑا اپنے ہی گھٹنے سے ٹکرا گیا۔ درد کی شدت کو بڑی مشکل سے برداشت کر کے بدحواسی میں ہتھوڑا گھما کر اہرنی پر مارنا چاہا تو ساتھ ہی خود بھی لڑھک گیا۔ سنبھل کر اٹھا تو دہقان ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے اور لوہار لوہے کے ٹکڑے کو انگاروں پر دھرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "کچھ دن باقی تھے جو ہتھوڑا میرے سر سے بالشت بھر کے فاصلے سے گزر گیا۔ ورنہ لوہے کی جگہ انگاروں پر میری کھوپڑی کے ٹکڑے سلگ رہے ہوتے۔ واہ رے شہری بابو۔ آیا ہے وہاں سے کر یا پڑھنے۔ تُو ہتھوڑا خاک چلائے گا۔ قلم چلایا کر قلم!"

اگر لوہار کی دکان کے سامنے کوئی کنواں ہوتا تو محمود ضرور چھلانگ لگا دیتا اُس میں۔ کترا کر باہر نکلا اور گاؤں سے پرے ایک چٹان پہ بیٹھ کر

کتابوں کی رٹی ہوئی تحریروں کو اپنے دماغ کی سلوٹوں میں سے کریدتا رہا۔

دو چار روز اُس نے گلیوں کے بے مطلب چکّر لگائے کہ محض اتفاق سے، یُونہی جاتے جاتے، — بھولے سے — تقدیر پلٹا کھائے اور کوئی لڑکی مُسکرا دے — اور اُس کے محبوب مصنّفین کی تحریریں اُس کے ذاتی تجربات کی زد میں آکر اور اُجاگر ہو جائیں — مگر وہ چلتی پھرتی بجلیاں اسے دیکھ کر بازو بلند کرکے گاگریں سنبھالتیں اور غصیلی ناگنوں کی طرح موڑ کاٹ جاتیں!

گاؤں سے نکل کر کھیتوں کے چکّر کاٹنے لگا مگر کُھرپے چلاتی ہوئی لڑکیوں کے دھوپ سے تپے ہوئے پُرجلال چہرے دیکھ کر اُس کے دماغ کی نسیں طنبورے کے تاروں کی طرح کھچ کر رہ جاتیں۔ اور ایک بار تو ایک گنجان کھیت سے قہقہے سے بلند ہوئے اور پھر آواز آئی "یہ مسافر کیسے چلتا ہے گلابو! بالکل ہِرنی کی طرح پھدک پھدک! پھدک پھدک! شہری لگتا ہے مجھے۔"

"بڑے فسادی ہوتے ہیں یہ شہری" دوسری بولی "فرنگی نے انھیں کئی جادو سکھا رکھے ہیں۔"

محمود ان کی باتیں سُننے کے لئے ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا، تو پیچھے سے کسی نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک اُدھیڑ عمر دہقان

لال لال آنکھیں نکالے اُسے گھور رہا تھا "کیا کر رہے ہو یہاں؟"

"میں — میں —" محمود کو تعزیرات کی سب دفعات اور اُن کی سب تاویلیں بھول گئیں۔ "میں سیر کر رہا تھا۔"

"سیر کر رہا تھا!" دہقان نے محمود کے الفاظ طنزاً دُہرائے۔ "تو پردیسی ہے، مسجد میں رہتا ہے، کریا پڑھتا ہے ورنہ وہ بے بھاؤ کی لگاتا کہ سیر ویر کے مزے بھول جاتے بچہ جی کو — تو مجھے اشراف لگتا تھا پر یہ کھیتوں میں ہماری بہو بیٹیوں کو جھانکنا تو اشرافوں کا کام نہیں۔ یہ تو کمینوں کے چلن ہیں!"

اُدھر سے ایک بوڑھا لاٹھی ٹیکتا آیا، اور اُدھیڑ عمر دہقان کا ہاتھ تھام کر بولا "رہنے دے اللہ نواز۔ میں سمجھاتا ہوں بے چارے کو" اور پھر محمود کا بازو پکڑ کر ایک طرف جانے لگا۔ دونوں لڑکیاں ایک ہاتھ میں خمیدہ درانتیاں اُٹھائے دوسرے ہاتھ سے اڑتی ہوئی اوڑھنیاں سنبھال رہی تھیں اور بہت دُور کسی گھاٹی میں کوئی چرواہا گا رہا تھا ؎

گوری چالاں چلے البیلیاں
موراں نوں مات کرے!
گوری کالیاں زُلفاں کھولیاں
دِناں نوں رات کرے!

گوری منڈے ولوں اکھیاں پھیریاں
بُھل کے ناں بات کرے!

گیت کا ہر لفظ لوہار کے بھاری بھرکم ہتھوڑے کی ضربیں بن کر محمود کے شکست خوردہ تصورات کو کُچلے دے رہا تھا کہ اچانک بوڑھا رک گیا۔ اور بولا: "دیکھ بھئی! تجھے بھلے کی بات کہوں۔ گلیوں میں ننگے سر نہ پھرا کر۔ گھٹ پر نہ جایا کر۔ تصویریں نہ اُتارا کر۔ سمجھا؟ کسی جی جلے کے پالے پڑا تو پکڑ کر اُلّو کر دے گا۔ جوانی میں نے بھی شہروں میں گزاری ہے۔ وہاں کس چیز کی کمی ہے آخر! لڑکیاں دیکھنی ہوں تو تھیٹر چلے جاؤ، گیت سُننے ہوں تو گراموفون خرید لو، تصویریں اُتارنی ہوں تو باغ موجود ہیں۔ ہماری لڑکیاں کھیل تماشے نہیں کرتیں۔ یہ لاہور نہیں۔ بے چارا جھنڈی پُور ہے۔ سنبھال اپنے آپ کو۔"

محمود کا جبڑہ لٹک گیا۔ بولا۔ "خیال رکھوں گا۔"

جب وہ پلٹا تو لہلہاتے ہوئے کھیت زہر کے موجیں مارتے ہوئے سمندر بن گئے۔ آس پاس ٹیلوں پر چرواہیوں کے سائے ڈائنوں کی شکل اختیار کر گئے۔ حجرے میں گیا، تھیلا اُٹھایا۔ اور باہر جانے لگا تو امام صاحب جو مسجد کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے، بولے: "کہاں چلے مسافر میاں؟ تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے!"

"میں سُن چکا ہوں سب باتیں"، محمود بولا۔ "آپ کی مہربانیوں کا شکریہ"

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ لیکن ——" امام صاحب نے گھبرائے ہوئے محمود کو مہربان نظروں سے دیکھا۔ "لیکن سنبھل کر جانا بچے! چوپال سے کترا کر دو کانوں والی گلی سے نکل جانا۔ تصویروں والی کل چھپا لینا کہیں۔ دہقان بگڑے بیٹھے ہیں چوپال پر۔ تمھارے متعلق پنچایت ہونے والی ہے۔"

وہ گاؤں سے نکل کر جب ایک درے میں پہنچا تو مڑ کر دھندی لیر کو دیکھا —— اتنی وسیع دنیا میں ایک بھورا سا حقیر دھبہ —— کھلے میدان پر مری ہوئی چوہیا —— کیڑوں سے بھری ہوئی! —— بدبو سے سڑی ہوئی!! —— اُجڈ گنواروں کا وطن —— آریوں کی آمد سے پہلے کا ہندوستان —— جس نے ایک پڑھے لکھے کھاتے پیتے شہری کو اُگل دیا تھا!

سٹیشن پر آ کر ٹکٹ خریدنے لگا تو کھڑکی کی پسلی طرف سے بابو بولا۔ "سیر ہو گئی مسٹر؟"

"جی ہو گئی۔" محمود بولا۔

"اب تک ہو جانی چاہئے تھی۔" بابو نے کھاک سے ٹکٹ پنچ کیا اور محمود کی طرف پھینک دیا۔

گاڑی میں آ کر بیٹھا۔ گھبرایا ہوا تو تھا ہی، لوگ گھور گھور کر دیکھنے لگے۔

قریب ہی بیٹھے ہوئے دہقان نے شریر مُسکراہٹ کو ہونٹوں کے پیچھے دبائے رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا " بابو جی۔ آپ کے مُنہ پر مکھی بیٹھی ہے"۔
اور محمود بھڑک کر بولا " ہاں ہاں میٹھی ہے، میٹھی رہنے دو، مکھیں کیا؟"
شریر دہقان بولا " مگر کیا آپ نے کوئی میٹھی ——"
" ہاں ہاں۔ میں نے رس گلے کھائے ہیں!" محمود گرج اُٹھا۔ لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد سارا کمرہ کرخت قہقہوں سے گونج اُٹھا اور اگلے سٹیشن پر محمود کو ڈبہ بدلنا پڑا۔

ایک رات چوپال پر

بھدّے سے چولھے کے ارد گرد اُلجھی ہوئی سفید ڈاڑھیوں والے بوڑھے، اکڑی ہوئی مونچھوں والے بانکے گبرو اور گرد آلود بالوں والے ننھے بچے بیٹھے تھے اور گاؤں کا ذیلدار دو تین کسانوں کی چادروں کا تکیہ بنائے لیٹا تھا۔ فتو میراثی اور نورا دھوبی اُس کے پاؤں دبا رہے تھے۔ دیواروں پر پھیلے ہوئے اُن کے دھندلے سائے شعلوں کے اشاروں پر دھیرے دھیرے ناچ رہے تھے۔ تڑک تڑک کی آواز سے لکڑیاں جل رہی تھیں اور چنگاریاں دھوئیں میں لپٹی ہوئی سیاہ چھت کی طرف اُڑی جاتی تھیں۔ ایک طرف سے بوڑھے میراثی شیرو نے حقّے کا دور شروع کیا۔ گڑگڑ گڑگڑ کی آواز میں ذیلدار نے کروٹ بدلی اور بولا: "کیا کہا تھا میں نے؟"

ایک نوجوان آگے جھک کر بولا: "آپ ہوٹل والے سے اُلجھ پڑے اور اُس کے جبڑوں میں ایک جلی ہوئی لکڑی گھسیڑ دی۔"

ذیلدار نے ہاتھی دانت کی ننھی سی کنگھی کو کنپٹی کے بھوسلے بالوں میں اٹکاتے ہوئے کہا: "ہاں ہاں۔ میں تو لوگ اکٹھے ہو گئے۔ بیچ بچاؤ ہو گیا اور معاملہ ختم ہوا۔ میں وہاں سے وکیل کے مکان پر گیا۔ دیکھتا کیا ہوں

کہ میز پر ایک صندوقچہ رکھا ہے اور وکیل کے سب بال بچے نوکر چاکر اس میں سے گانا سُن رہے ہیں!

میں نے پوچھا "وکیل جی! ریکارڈ کہاں چھپا رکھا ہے اور سوئی کہاں لگاتے ہیں آپ؟"

بولے "یہ ریڈیو ہے ریڈیو۔"

میں نے کہا "یہ کیا بلا ہے؟"

کہنے لگے "ہم اب یہاں سرگودھا میں بیٹھے بمبئی کا گانا سُن رہے ہیں!"

"میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے بھی ساری عمر سفر میں گذاری ہے۔ ایک تو مقدموں کا سلسلہ ہی ختم نہ ہوا۔ دوسرے ذیلداری کا معاملہ ہے۔ کبھی گواہی پہ جا رہا ہوں تو کبھی صاحب بہادر کو سلام کرنے کبھی کوئی اور پیشی بھگتنے۔ سو کام ہوتے ہیں ہم لوگوں کو۔ لاہور میں بھی ایک بار گیا تھا لیکن میں نے ایسی مشین کہیں نہیں دیکھی کہ سرگودھا میں بیٹھے کلکتے اور بمبئی کا گانا سُنتے رہو۔ اصل میں ان وکیلوں کو جھوٹ بولنے کے سوا چین ہی نہیں آتا۔ میں نے ہنس کر کہا "کیوں جی! آپ مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں کیا؟"

"تمام لڑکے بالے ہنس دیئے اور وکیل بھی ہنستے ہنستے کرسی پر جھک گیا۔

میں سمجھا مذاق کر رہے ہیں۔ ان شہریوں کے مذاق بھی عجیب قسم کے ہوتے ہیں۔ ذرا ذرا سی باتوں پر اتنے اتنے بلند قہقہے لگاتے ہیں جیسے کوئی مسخرہ غضب ڈھا گیا۔ ایک دن میں غلطی سے سرگودھا کے اڈے پر ایک شخص سے پوچھ بیٹھا۔ "کیوں بھئی۔ یہاں سے سرگودھا کا کرایہ کیا ہے؟"

"وہ پہلے تو ہکا بکا مجھے گھورتا رہا مگر اچانک اس زور سے ہنسا کہ میرے ہاتھوں سے پھلوں کی ٹوکری گرتے گرتے بچی۔ تمام ڈرائیور اکٹھے ہوگئے اور کہنے لگے "اجی ملک صاحب! آپ سرگودھا میں کھڑے سرگودھا ہی کا کرایہ پوچھتے ہیں!"

"آخر اس میں ہنسی کی کونسی بات تھی۔ چام کی زبان ہے۔ بہک جائے تو کسی کا کیا بس۔ کیوں چچا اللہ یار؟"

سب بوڑھوں نے ذیلدار کے بیان کی تصدیق کی۔ ذیلدار کمنی کے بل ہو کر بولا "ہاں تو وکیل صاحب بولے "یہ نیا آلہ ہے اور اس کے تار وار کچھ نہیں۔ بس بمبئی میں ایک شخص گا رہا ہے اور ہم اس کا گانا سن رہے ہیں۔"

"میں تو قرآن مجید کی قسم یہ جھوٹ سن کر بہت پریشان ہوا۔ ہزاروں میل دور ایک شخص گا رہا ہے۔ تار وار ہے نہیں۔ اور وکیل میاں مزے سے اس کا گانا سن رہے ہیں تو گویا خدا ان کے قابو میں آگیا۔ گویا اب

لوگوں نے جنوں بھوتوں پر بھی قبضہ جما لیا۔ اب یہ جن بھوت کا کام نہیں تو اور کیا کہ اچانک وکیل نے لندن پر سوئی گھمائی اور کوئی عورت بلبے بلبے بین کرکے رونے لگی۔ وکیل کہتا تھا "یہ انگریزی گانا ہے" مگر اللہ نے مجھے بھی کان دے رکھے ہیں۔ گانے اور رونے کا فرق خوب سمجھتا ہوں۔ اس نئی بات پر حیران تھا کہ وکیل نے مصر پر سوئی گھما دی۔ عربی گھسنے بولنے لگے۔ لاہور پر گھما دی۔ آواز آئی۔ یہ لاہور ہے! میں تو ہڑبڑا کر کرسی پر جا گرا اور وکیل کے بچوں اور نوکروں چاکروں کو دیکھا تو وہ فرش پر مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ میں غصے میں وہاں سے اٹھ کر سرائے میں آگیا اور دوسرے دن گواہی دے کر گھر چلا آیا۔ میرے دماغ میں یہ بات نہیں سماتی اور اگر یہ بات سچ ہے تو کوئی دن میں قیامت آئی جانو!"

بوڑھا اللہ یار ہاتھ سینک کر چہرے پر ملتے ہوئے بولا "ہاں جی! غضب ڈھا رہے ہیں یہ لوگ۔ اڑتی چڑیا کے پر جیسے انھوں نے گنے ہیں، شاید ہی کوئی اور گنے۔ زمانے کا حلیہ بگاڑ دیا ہے انھوں نے! اب اگر ہمارے باپ دادا خدا کی قدرت سے زندہ ہو کر یہاں آئیں تو دہل کر پھر مر جائیں۔ ریل دیکھو! کالی کلوٹی لوہے کی مشین پشور سے لہور اور لہور سے دلّی تک بھاگتی جاتی ہے اور نہیں تھکتی۔ یہ گرامفون باجا دیکھا آپ نے؟ کون بولتا ہے ان کالے توووں میں؟ بس چابی گھما دو۔ سوئی اوپر رکھ دو۔

اور "ولدار کنداں والے دا" - "ڈاچی والیا موڑیں مہار وے" - "بالو" - "پھٹی" جو گانا چاہو سُن لو۔ یقین نہیں آتا تھا پر آنکھوں سے دیکھا، کانوں سے سُنا، ہاتھوں سے چھُوا بھی۔ جادو وادو تو ہے نہیں، بس کسی پیچ کی تقصیر ہے کہ آواز کو قید کر رکھا ہے۔ مجید خاں تھانے دار کے بیٹے وحید سے کل میں نے سُنا کہ بڑے شہروں میں رات کو تماشے ہوتے ہیں، سفید چادروں پہ تصویریں چلتی پھرتی ہیں، گھوڑے دوڑتے ہیں، گاڑیاں بھاگتی ہیں، ایک سفید چادر پر ساری دُنیا لا کر رکھ دی مگر مجھے تو اس کا یقین نہیں آتا ملک جی! انگریزی پڑھے ہوئے یہ گٹ مٹ کرنے والے لڑکے جھوٹ بہت بولتے ہیں۔"

ملک صاحب انگڑائی لے کر اُٹھے اور حقّے کو قریب لانے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے "بچا اللہ یار! قسم قرآن مجید کی۔ میں نے ان آنکھوں سے یہ تماشا دیکھا۔ چلنا پھرنا تو ایک طرف رہا یہ تصویریں تو بولتی بھی ہیں۔ اُن کے ہنسنے، رونے، بھاگنے، دوڑنے کی آوازیں آتی ہیں۔ پانی گرنے کی، کاغذ پھاڑنے کی، دروازہ کھلنے کی! — خدا کی قسم سب آوازیں!"

ایک اور بوڑھا بولا "اب آپ کی زبان سے یہ سُن رہے ہیں۔ کوئی اور کہتا تو ہم اُسے پاگل سمجھتے۔"

ذیلدار ذرا جھینپ گیا۔ بولا "اے بابا! میں نے دو چار بار یہ تماشا دیکھا۔ اب وحید یہاں ہوتا تو گواہی دیتا۔ اس کے ساتھ میں نے ایک

تماشا دیکھا۔ ایک نوجوان کو سات آدمی تلواروں سے مار رہے تھے میں بھول گیا کہ یہ تو صرف تماشا ہے۔ بس چیخ اُٹھا" ارے غضب خدا کا، کوئی بھی اس غریب پہ ترس نہیں کھاتا۔ ارے خدا کے بندو! ایک بے کس بے گناہ پیٹا جا رہا ہے اور تم بیٹھے دانت نکال رہے ہو!"

"بھلا ہو وحید کا جس نے بازو سے پکڑ کر مجھے بٹھایا اور بتایا کہ یہ تو صرف تصویریں لڑ رہی ہیں۔ تب جا کر مجھے اپنی غلطی کی خبر ہوئی۔ اتنا دھوکا کھا جاتا ہے انسان!"

"سبحان اللہ سبحان اللہ! غضب کر دیا۔ کمال کر دکھایا!" کی آوازوں سے چوپال کے دھواں دھار کمرے میں ایک دبی دبی سرسراہٹ کی آواز آنے لگی۔

ذیلدار نے چادروں کو گول کر کے کہنی کے نیچے دھرتے ہوئے کہا "مگر اس ریڈیو والی بات کو میں مر بھی جاؤں تو بھی نہ مانوں۔ جھوٹ کو سچ کیسے کہوں؟"

کمرے کے کواڑ اچانک چیختے ہوئے کھلے۔ ایک نوجوان سنہری عینک لگائے انگریزی بالوں پہ ہاتھ پھیرتا ہوا اندر آیا اور ایک طرف بوٹ اتارتے ہوئے بولا" السلام علیکم" سب نے جواب دیا" وعلیکم السلام"۔

ملک جی بولے "آؤ وحید خاں! اچھے ہو؟ تمھاری ہی باتیں ہو رہی

ہیں۔ اللہ یار تم سے بدگمان ہے۔ کہتا ہے تصویروں والے تماشے کی بات جھوٹ ہے۔ وحید جھوٹ بولتا ہے۔"

وحید مسکرایا اور اللہ یار کی طرف دیکھ کر بولا: "اچھا بابا! جھوٹ ہی سہی! تم نہ مانو۔ بزرگوں کو مجبور کون کرے۔ لیکن میں ان کم بخت آنکھوں کو کیا کروں جنھوں نے خود چلتی پھرتی اور بولتی چالتی تصویریں دیکھی ہیں مجھیں دلیلیں دے کر سمجھاؤں تو بھی تم اُسی طرح کورے کے کورے رہتے ہو۔ کل ہی یہاں الاؤ پر زمین کے متعلق بات چھڑ گئی تھی۔ میں نے کہا زمین گول ہے۔ تو چچا اللہ یار برس پڑا۔"

چچا اللہ یار نے ایک لکڑی سے انگاروں کو اکٹھا کرتے ہوئے کہا: "وحید خاں! بات سُن میری۔ قسم قرآن مجید کی، کل تو میں تیری اس بات کو مذاق سمجھا تھا، آج پھر اسے چھیڑ دیا تو بتا زمین کس طرح گول ہے؟"

وحید سنجیدگی سے بولا "اگر یہاں سے کوئی مشرق کو منہ کر کے چلے اور چلتا ہی جائے تو ایک نہ ایک دن پھر یہیں پہنچ جائے گا۔"

چوپال میں ایک قہقہہ بلند ہوا۔ ذیلدار نے منہ میں کپڑا ٹھونس کر ہنسی روکنی چاہی۔ بچے ایک دوسرے کو دھکے دے کر فرش پر لوٹنے لگے۔ ہنستے ہنستے چچا اللہ یار کی پگڑی کھل گئی۔ آخرکار اُس نے ضعیف آنکھوں سے پانی پونچھا اور وحید خاں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا "قیامت

تک ہوئے تیرا پڑھانے والا۔ کیا دلیل دی! اسے میں قربان جاؤں!
اسے بھئی! میں یہاں سے اُٹھ کر، تمام گاؤں کا چکر لگا کر پھر چوپال پر
آسکتا ہوں۔ لیکن گاؤں تو چپٹا ہے۔ پھر یہ کیسے ہُوا؟"

وحید خاں ان قہقہوں سے مانوس تھا۔ مسکراتے ہوئے بولا۔
"مگر میرا مطلب ایک ہی طرف کو جانے کا ہے۔"

اللہ یار بولا "میں بھی ایک ہی طرف کو جاؤں گا۔ لہور، امرتسر
تو نہیں جانے کا۔"

وحید نے کچھ جواب دیا مگر اُس کی آواز کرخت قہقہوں اور بے ربط
تالیوں کی گونج میں کھو کر رہ گئی۔

چچا اللہ یار نے یک لخت اپنا چہرہ سنجیدہ بنا لیا اور کہنے لگا "اچھا
تو وحید خاں! کوئی اور دلیل؟ لیکن دلیلوں کی ضرورت ہی کیا ہے! اللہ
نے ہمیں آنکھیں دے رکھی ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ زمین چپٹی ہے!"

وحید بولا "بابا! زمین کے مقابلے میں ہمارا وجود بہت ہی چھوٹا
ہے۔ اب اگر چیونٹی بہت بڑی گیند پر بیٹھ جائے تو اسے گیند چپٹی ہی
نظر آئے گی۔"

چچا اللہ یار کا چہرہ ہنسی روکنے کی کوشش میں لال ہو گیا "کیا تم چیونٹی
بن کر کبھی گیند پر بیٹھے ہو؟"

قہقہوں اور تالیوں کا ایک ادر طوفان اُٹھا اور دیواروں پر تلپچتے ہوئے سلسلے ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔

ذیلدار پکار اُٹھا: "ارے بابا اللہ یار! قسم قرآن مجید کی، تُو نے تو مجھے ہنسا ہنسا کر بے حال کر دیا۔ پسلیوں میں درد ہو رہا ہے۔ تیرے آگے وحید کی کچھ نہیں چلتی۔ سچ کہا تُو نے آخر چیونٹی کیا جانے انسان کی باتیں!"

وحید خاں ذرا چیں بجبیں ہو کر بولا: "ملک جی! آپ تو سمجھ دار ہیں۔ میں آپ سے ہی بات کروں گا۔ سُنیئے! آپ گیلی مٹی کی ایک مٹھی لے لیں۔ اور اسے زور سے گھمائیں، جب مٹی تیزی سے گھومے گی تو وہ پہلے سے گول شکل اختیار کرنے لگے گی۔ ہر گھومنے والی چیز گول ہوتی ہے۔"

ذیلدار نے کہا: "لیکن ہم تو زمین کا ذکر کر رہے ہیں۔"

وحید بولا: "زمین بھی گھومتی ہے۔"

ذیلدار نے ہنستے ہوئے کہا: "یہ نئی بجلی گری!"

چچا اللہ یار پکار اُٹھا: "یہی کچھ پڑھا ہے تو نے مدرسے میں! زمین گھومتی ہے! سبحان اللہ! معاف کیجو وحید خاں! مجھے تمہارے دماغ میں کچھ خلل معلوم ہونے لگا ہے۔ زمین پہ مکان ہیں، پہاڑ ہیں، سمندر ہیں، اگر گھومتے گھومتے سمندر نیچے آ جائیں تو پھر پانی زمین پہ کیسے ٹھہر سکے گا؟ پہاڑ کیسے جمے رہ سکیں گے؟ ہم خود کیوں نہیں لڑھک جاتے! اور پھر اتنی عمر بیتی۔

میں نے اپنے آپ کو کبھی اُلٹا چلتے نہیں دیکھا کہ سر نیچے ہو اور پاؤں اُوپر!"

وحید آہستہ سے بولا "زمین کے اندر کشش موجود ہے جو ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔"

اللہ یار تڑپ اُٹھا "زمین نہ ہوئی مقناطیس کا پہاڑ ہو گیا۔ خاک کے ڈھیر میں کیا کشش ہو گی آخر! زمین میں کشش ہے، زمین گھومتی ہے، زمین گول ہے، یہ تو قیامت کی نشانیاں ہیں۔"

وحید خاں، ایک تو اپنی ہٹ کا پکّا تھا۔ دوسرے اس قدر تجربہ کار بھی تو نہ تھا کہ چُپ ہو رہتا۔ بولا "اگر زمین نہیں گھومتی تو پھر دن اور رات کیسے پیدا ہوتے ہیں؟"

تمام چوپال نے یکزبان ہو کر کہا "سُورج گھومتا ہے۔"

وحید بولا "نہیں۔ زمین گھومتی ہے اور سُورج ساکن ہے۔"

ایک کونے سے ایک سفید ریش بزرگ کھانستا ہوا اُٹھا اور وحید کے قریب بڑی مشکل سے بیٹھتے ہوئے کہنے لگا "خاموش! ایک ذرا سی بات میرے بچے! تو کہتا ہے زمین گھومتی ہے۔ میری عمر نوّے سال کے قریب ہے۔ میں نے تیرے پر دادا کو بھی دیکھا تھا۔ چوپال کا دروازہ ان دنوں بھی دکھن کی طرف تھا۔ آج بھی دکھن کی طرف ہے اور ہمیشہ دکھن کی طرف رہے گا۔ زمین گھومتی ہے تو اُس کا رُخ ضرور پورب، پچھم، اُتر

کی طرف پھر جاتا۔ سادہ سی بات کہی ہے میں نے۔ اب اس کا جواب دے۔"
خاموشی چھا گئی۔ ایک کونے سے ذیلدار کی گُگڑئے کی سانسوں کی آواز صاف سُنائی دینے لگی۔ وحید بولا "مگر بابا! چوپال تو اپنی جگہ پر کھڑی ہے۔ صرف زمین گھومتی ہے، چوپال تو نہیں گھومتی!"
بوڑھے نے کہا "مگر چوپال زمین پہ ہے نا۔ زمین گھومی تو ساتھ ہی یہ بھی گھومی۔ میرے پاؤں گھومے تو ساتھ ہی سر بھی گھوما۔ کیوں؟"
"مگر ۔۔"
مگر وحید کی آواز کسی نے نہ سُنی اور تمام مجمع سفید ریش بزرگ کی طرف دیکھنے لگا جو وہاں سے اُٹھ کر پھر اپنے کونے میں بازو کا تکیہ بنا کر اطمینان سے لیٹ گیا تھا جیسے وہ تمام دُنیا کو فتح کر آیا ہو!
ذیلدار نے پگڑی باندھتے ہوئے کہا "بزرگوں کا دم غنیمت ہے ورنہ وحید نے تو ہمیں لاجواب کر دیا تھا؟"
وحید عینک صاف کرتے ہوئے بولا "ملک جی! واللہ اسی لئے چوپال پہ آنے کو جی نہیں چاہتا۔ میری بات کوئی سمجھتا تو ہے نہیں اور پھر گلیوں میں ہر کوئی کہتا ہے۔ چوپال پہ آیا کرو، چوپال پہ آیا کرو۔ آخر کس بات پر آؤں یہاں؟ سادہ سادہ باتیں آپ نہیں سمجھ سکے۔ آپ کو ریڈیو، سینما پہ یقین نہیں آتا!"
چچا اللہ یار داڑھی میں اُنگلیاں پھیر کر بولا "کیسے آئے جب یہ بات دماغ

میں نہیں سماتی !"

چوپال کا دروازہ اچانک کھلا۔ آبنوسی رنگ کا ایک نوجوان تیزی سے اندر گھسا اور پکار اٹھا "ملک جی! سات سات مبارک، لاکھ لاکھ مبارک !!"

ذیلدار نے چونک کر پوچھا "کیوں کیا بات ہے ؟"

کالے آدمی نے دانت نکالتے ہوئے کہا "اللہ نے آپ کو فرزند بخشا ہے!"

ہر طرف سے صدائیں بلند ہوئیں "مبارک۔ مبارک۔ مبارک۔"

چچا اللہ یار مسکراتے ہوئے بولا "سبحان اللہ۔ چھ لڑکیوں کے بعد لڑکا۔ کتنی خوشی کی بات ہے !"

ذیلدار نے اٹھ کر کہا "ہاں چچا! بس ایک بزرگ کی مہربانی ہے۔ بڑی منتوں کے بعد ان سے تعویذ لایا تھا۔ انہی کی کرامات ہے!"

تمام مجمع کھڑا ہو گیا اور ذیلدار کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وحید اللہ یار کو ایک طرف لے جا کر بولا "کیا کوئی بزرگ لڑکی کو لڑکا اور لڑکے کو لڑکی بنا سکتا ہے ؟ تجھے یقین ہے چچا ؟"

اللہ یار بولا "ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ میں بھی تو ایک جوگی کی دعا سے پیدا ہوا تھا۔"

وحید مفلر سے منہ لپیٹ کر ایک گلی میں مڑ گیا۔

اُدھورا گیت

پھٹی ہوئی اوڑھنی ایک کیل سے لٹکا کر جب سیماں کھاٹ پر لیٹی تو اُسے اندھیرے میں اچانک اُجالے کا ایک دائرہ سا اُبھرتا دکھائی دیا۔ اور اس اُجالے کے قوسی خط پر اُسے بہت سی پرچھائیاں تیرتی نظر آئیں۔ — گاؤں کے نوجوانوں کی پرچھائیاں جن کے لمبے لمبے بال نھنے مسکراتے ہوئے چہرے تھے، اور کانوں میں سونے کی مُرکیاں تھیں۔ یہ پرچھائیاں کبھی سمٹ کر دُور نکل جاتیں، کبھی لپک کر قریب آجاتیں اور ایک پرچھائیں تو ہولے ہولے سرکتی سیماں کے پاس آگئی اور اُس کے گال چھُو لئے۔ گھبرا کر اُس نے اپنے گال پہ ایک ہلکا سا طمانچہ لگا دیا اور پھر جب اُس نے ادھر اُدھر دیکھا تو چاروں طرف اندھیرا چھا رہا تھا۔ صحن میں بیری کا درخت دم بخود کھڑا تھا اور گھڑوں کے قریب ایک سُوراخ میں ٹڈا چلا رہا تھا۔ — جاگتے میں خواب دیکھنا سیماں کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی اور اُس کے خوابوں پر گاؤں کے بانکے نوجوانوں کی پرچھائیاں چھائی رہتی تھیں — مُسکراتے ہوئے چہروں اور تڑپتی ہوئی مُرکیوں والے البیلے گبرو! — اُسے کبھی اپنے مرحوم ماں باپ کا خواب سوتے میں بھی دکھائی نہ دیا، جو چھ ماہ ہوئے

قحط اور بڑھاپے کا شکار ہو چکے تھے!

وہ اس کوٹھڑی میں اکیلی رہتی تھی۔ دن بھر کھاتے پیتے گھروں کے لیے چکی پیستی اور شام کو دو لقمے زہر مار کر کے کھاٹ پہ دراز ہو جاتی۔ پانی بھر نے جاتی تو چھوکریوں سے جُگتیں بچاتی اور کتراتی۔۔ اور جو کسی لڑکی کی آنکھوں سے آنکھیں مل جاتیں تو وہ قہقہے بلند ہوتے، کہ وہ آدھی گاگر ہی پہ اکتفا کر کے گھر لوٹ آتی۔

اس کے گھر کے چھوٹے سے آنگن میں بیری کا لمبو ترا سا درخت مرے ہوئے دیو کے سوکھے ڈھنچر کی طرح ایستادہ تھا جس پر نہ کبھی سبز طوطے آکر بیٹھے اور نہ شوخ ممولے، بلکہ بھولے بھٹکے کوّے اور بھوکی پیاسی چیلیں بے جان پر پھڑپھڑاتی، سوکھی ڈراونی شاخوں سے ٹکراتی، اُس کے تنے سے چمٹ جاتیں اور پھر کوئی عجیب سی بولی بول کر اُڑ جاتیں اور اندھیرے میں ان کے خوفناک سائے دیر تک منڈلاتے رہتے۔ گاگروں کے قریب جہاں دیوار میں ایک سوراخ تھا، آدھی رات کو ایک مینڈک ٹراپیں ٹیں پکار اُٹھتا۔ سیماں کی آنکھ کھل جاتی اور مینڈک کی مسلسل کھردری ٹیں ٹیں سے تنگ آکر جب وہ سوراخ پر اپنا بوسیدہ جوتا پٹختی، تو اُسے اچانک یوں محسوس ہوتا جیسے اُس مظلوم مینڈک کا وجود پھولنے اور پھیلنے لگا ہے اور وہ اپنی بے ڈھنگی ٹانگیں گھما گھما کر چلتا ہوا اُس کا گلا دبوچنے کے لیے بڑھا آرہا ہے۔

دراصل اُسے ہر چیز سے ڈر لگتا تھا۔ اندھیرے میں گاگریں دیکھ کر اُسے یُوں محسوس ہوتا جیسے بے شمار بونے اُس کی تاک میں بیٹھے چھریاں تیز کر رہے ہیں۔ چھت کی منڈیریں اکثر اُبھرنے لگتیں، حتیٰ کہ آسمانوں میں دھنس جاتیں اور پھر سیماں کے کانوں میں اس شدت کی گرج سُنائی دیتی کہ وہ پیچیدگیوں بھرے بستر پر سمٹ کر گٹھڑی بن جاتی اور جب گھبرا کر آنکھیں کھولتی، تو منڈیروں پر اُسے کئی اچھوتے سائے کلیلیں کرتے نظر آتے۔ زندگی کے متعلق اُس نے اپنی سمجھ کے مطابق کئی بار سوچا اور وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ زندگی سُوت کی انٹی ہے۔ احتیاط سے دھاگا اتارو تو طویل ہوگی، ورنہ ہر لمحہ باریک تار ٹوٹنے کا احتمال ہے اور وہ اکثر حیران ہُوا کرتی تھی کہ اُس کی زندگی کا تار کیوں نہیں ٹوٹتا، جب کہ فاقوں کے فولادی اور نکیلے پنجوں نے کئی بار اُس کی سانسوں کے تانے بانے کو اُلجھا سا دیا تھا۔

چکی کی گھمر گھمر میں وہ اکثر اس حد تک کھو جاتی کہ اناج ختم ہو جاتا اور خالی چکی کی بھیانک کھسر پھسر سے محلے والیاں چونک اُٹھتیں اور ناکوں پر انگلیاں رکھے، گردنیں ایک طرف جھکائے، پُتلیاں نچاتی، جب سیماں کے پاس آتیں تو دیکھتیں کہ گو اس کی آنکھیں کھُلی ہیں لیکن وہ سو رہی ہے۔ اُس کی نظریں سامنے دیوار کے کسی موہوم نقطے پہ پیوست ہیں۔ اُس کا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا ہے اور چکی اس تیزی سے گھوم رہی ہے کہ نور سے درزی کی مشین کی ہتھی بھی کیا

گھومتی ہو گی۔ ہے سیماں!" کہہ کر سب کی سب اس پر ٹوٹ پڑتیں اور جب وہ دیکھتی کہ آٹا تو کب کا پس چکا اور وہ خالی چکی گھمائے جارہی ہے تو لرز جاتی، شرمندہ ہو کر آٹا سمیٹنے لگتی۔ محلے والیاں دوپٹوں ہیں ناکیں چھپا چھپا کر ہنستیں اور چکی کی مالکن باہیں پھیلا پھیلا کر اُسے کوسنے دیتی "کل ہی تو تیرے باپ بتو لوہار نے چکی پر دن بھر ہتوڑے چلائے، آج پھر دونوں پاٹوں کو رگڑے جارہی ہے۔ اب اتنے گھسے ہوئے پاٹوں ہیں اناج خاک پسے گا! یہاں بیٹھی خواب دیکھا کرتی ہے اپنے ہونٹوں سوتوں کے رانڈ کہیں کی۔ اب جا! کوئی اور چکی والا گھر تلاش کر۔"

اور سیماں کوئی اور چکی والا گھر تلاش کر لیتی۔ لیکن یہ خواب — یہ اَن ہونے خواب وہاں بھی آدھمکتے، اور سامنے بھوری دیواروں پر ایسے نقوش اُبھارتے کہ اناج ختم ہو جاتا اور چکی کی گھمر گھمر کھسر پھسر میں تبدیل ہو جاتی!

ایک بار تو اُس نے ارادہ کیا کہ اپنی کمائی سے پیسہ پیسہ اکٹھا کر کے اپنی نئی چکی خرید لے، لیکن یہ سُن کر وہ بے حد متعجب ہُوئی کہ چکی کے پتھر جنگ کی وجہ سے بہت مہنگے ہو گئے ہیں اور آج کل سرکار نے پتھروں پر بھی ٹیکس لگا رکھا ہے!

پھٹے پُرانے گودڑوں کو دن بھر دھوتی رہتی، پسینے اور دھول سے

سُنتے ہوئے یہ چیتھڑے جب بدبُو اور مَیل اُگلتے، اور دیسی صابن کا جھاگ خواب آلود آواز میں شور کرنے لگتا، تو وہ ایک چادر میں لپٹی ہُوئی انھی اَن ہونے خوابوں میں ڈوب جاتی۔ کائنات چُپ سادھ لیتی، ہوائیں تھم جاتیں، سائے جم جاتے اور سیماں کے گرد آلود دماغ میں سوت کی اَنٹیاں اور نازک تار گھومنے اور پھیلنے لگتے۔ نیم وا ہونٹوں میں ایک غیر محسوس سی لرزش پیدا ہوتی، ابروؤں کی کمانیں جُھک آتیں، آنکھوں کی گہرائیاں اندھیری ہو جاتیں اور وہ سوچتی رہتی کہ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے اور کب تک رہے گا۔ کیا اور کیوں اور کب کا یہ طوفان لمحہ بہ لمحہ زور پکڑنے لگتا اور وہ چیتھڑوں کو کھُردرے پتھروں پہ اس زور سے مروڑتی کہ وہ چِر چِر پھٹ کر چیخنے لگتے اور پھر جب وہ خشک ہو جاتے تو وہ ایک زنگ آلود سوئی لے کر بیٹھ جاتی اور تب تک یہ چاک سیتی رہتی، جب آسمان کی دھندلاہٹوں میں سفید سفید چنگاریاں سی بکھر جاتیں اور چیلوں اور کوّوں کے لمبے لمبے سائے فضاؤں میں سرسرانے لگتے۔

وہ ایک دوپہر کو اپنے چیتھڑے دیوار پہ پھیلا رہی تھی کہ اُسے گلی میں لوگوں کا شور سُنائی دیا، اور چونکہ وہ ہر بات میں دلچسپی پیدا کر کے اپنا من پہ چلنے کی دُھن میں رہتی تھی، اس لیے اُلٹا سیدھا چولا پہن کر بھاگی اور دیکھا کہ گلی میں بہت بھیڑ ہے۔ بوڑھے، جوان اور بچے ایک دوسرے پر

گرے پڑتے ہیں، ڈھول بج رہا ہے، شہنائیاں گونج رہی ہیں اور چھتوں پر نوجوان لڑکیاں پھولوں کی جھولیاں بھرے کھڑی ہیں۔ وہ کسی سے یہ نہ پوچھ سکی کہ آج کون سا تہوار ہے، کیونکہ اُسے یقین تھا کہ لوگ اُس پر ہنس دیں گے۔ ایک دو عیدیں آئیں اور گزر گئیں، اور پھر کتنی روز بعد اُسے معلوم ہوا کہ عید بھی آئی تھی، لوگوں نے بھڑکیلے کپڑے بھی پہنے تھے، مرغن کھانے بھی پکے تھے، مولوی جی نے پُرانی کالی مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر غریبوں اور بیکسوں کی امداد کرنے کی درخواست بھی کی تھی اور پھر اس کے بعد خود جھولی پھیلا کر قرآن مجید کی آیات اس رقت سے پڑھی تھیں کہ لوگوں کے نئے کپڑے آنسوؤں سے بھیگ گئے تھے۔ خدا جانے کیا بات تھی کہ عید سے کئی روز پہلے اور عید سے کئی دن بعد وہ گوشہ نشین سی ہو جاتی اور پھر جب گھر سے نکلتی، تو عید گزر چکی ہوتی اور گوری ہتھیلیوں پر مہندی کے رنگ پھیکے پڑ چکے ہوتے۔

اچانک گلی کے تنگ موڑ پر ایک شخص ایک انبوہ میں گھرا ہوا نمودار ہوا۔ قدم قدم پر مسکراتا ہوا خوبصورت اجنبی! لمبے لمبے بالوں اور ننھی ننھی سنہری مونچھوں والا البیلا نوجوان ——— یسماں کسی سوچ میں پڑ گئی! ——— چھتوں پر سے سرسوں کے پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ فضا میں پیلے پیلے تارے سے بکھر گئے، اور ان میں اس اجنبی کا چاند سا چہرہ بہت

بھلا معلوم ہونے لگا۔ سیماں کے دل میں ایک اُلجھن سی پیدا ہوئی، اُس کا
جی چاہا کہ وہ بھی کچھ تو اس اجنبی کے نذر کرے جس کی ہر حرکت پر گاؤں
والے قربان ہو رہے تھے اور جب وہ اجنبی اُس کے قریب آیا،
تو وہ گھبرا سی گئی۔ ہاتھ بڑھایا مگر چیتھڑے میں اُلجھ گیا۔ بے قرار ہو کر ہاتھ
کو جھٹکا دیا اور نئے ٹلنکے ٹوٹ کر بکھر گئے، لپک کر سرسوں کا ایک پھول
خاک پر سے اٹھایا اور نوجوان اجنبی پر نچھاور کرنے کے لئے اٹھی تو کائنات
کے دور دراز کونوں سے نقرئی گھنگھروؤں کی جھنجھناہٹیں بلند ہوئیں اور ہوا
میں دھوئیں کے سے بل کھاتی اُس کے دل و دماغ میں تڑپنے لگیں۔
نوجوان ٹھٹک کر اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ اُوپر اُٹھا کر سیماں نے
سرسوں کا پھول ہوا میں اُچھال دیا۔ پھول نوجوان کی سنہری مونچھوں میں
اٹک گیا۔ مسکرا کر وہ پھول اُس نے جیب میں ڈال لیا اور پھر ہمراہیوں
سے کچھ کہتا آگے بڑھ گیا۔ اُس کی آواز ڈھول، شہنائیوں اور لوگوں کی
مسرت بھری چہل پہل میں ڈوب گئی۔ وہ کچھ نہ سن سکی، مگر اسے اتنا ضرور
محسوس ہوا کہ نوجوان نے اُس کا مذاق اُڑایا ہے!

لیکن وہ تھا کون!

وہ بیقرار سی ہو گئی اور ہمت باندھ کر ایک بڑھیا سے پوچھ ہی لیا:
"خالہ یہ شخص کون ہے؟"

اور بڑھیا ناک بھوں چڑھا کر بولی "تو جا کر گھر میں خواب دیکھ نواب! تُو اتنا بھی نہیں جانتی کہ ہمارے گاؤں میں ملک کا اتنا بڑا شاعر آیا ہے' ایسے ایسے گیت اور دوہے بناتا ہے کہ ولایت والے بھی جھوم جھوم جاتے ہیں!"

"اچھا، تو بہت بڑا آدمی ہے یہ اجنبی!" سیماں نے اپنے جی میں کہا' اور ہولے ہولے قدم اُٹھاتی گھر آ گئی۔ اس کے جی میں اُمنگ اُٹھی کہ وہ بھی کوئی بیت کہے۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ دُنیا کے سب لوگ بیت نہیں کہہ سکتے، حالانکہ بیت عام باتوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتے۔ بہت دیر تک سوچتی رہی کہ وہ بیت کیسے کہے' اور اس بیت میں کون سی بات کہے اور پھر اُسے کیسے گائے اور کسے سُنائے!

نصف شب کو اچانک گاگروں کے قریب سُوراخ میں ٹڈا چیخا۔ اُس نے جوتا اُٹھایا' اور گھما کر ٹڈے پر پھینکنے ہی والی تھی کہ اُس کا ہاتھ رُک گیا۔ ٹڈے کی ہیں ہیں میں اُسے ایسے سُریلے بول سنائی دینے لگے جو اُس نے اس سے قبل کبھی نہیں سنے تھے۔ دور آسمان کے گنبد میں ستارے ٹناٹ رہے تھے۔ بیری کا بوڑھا درخت طوبےٰ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ مٹی کی دیواروں پر اُسے الف لیلہ کی شہزادیوں کے محلّوں کا گمان ہونے لگا۔ وہ بستر پر کروٹیں بدلنے لگی اور جسم و جان کی اس خلش آمیز بے چینی میں

اُسے ایک ایسی لذت محسوس ہوئی کہ اُس کے ہونٹ مسکرانے کی جرأت بھی کرنے لگے۔ وہ مسکرائی اور یوں ہی وارفتگی میں کچھ گنگنانے لگی۔

نانا نانا نن نن نانا نن نن نانا نانا

اُس کی آنکھوں پر پپوٹے جھک آئے؟ اور اس سیلی 'نانا نانا' کی دھندلاہٹوں میں سے ایک دکار کا گیت اُبھرا۔

مجھ سے پیت نہ کرنا

بانکے

مجھ سے پیت نہ کرنا!

"پیت؟" اچانک اُس نے اپنے آپ سے پوچھا، اور پھر اپنے مُنہ پر ہلکا سا طمانچہ مار کر بولی "پگلی!"

لیکن گیت کے ابتدائی بول ڈھل چکے تھے اور 'پیت' کا لطیف لفظ اُس کے دل و دماغ میں تیر چکا تھا!

"کیسی پیت؟ کس کی پیت؟" اُس نے پھر گھبرا کر اپنے آپ سے پوچھا مگر کوئی جواب نہ پا کر وہ پھر تیزی سے کروٹیں بدلنے لگی۔ اُس کے بال کھاٹ سے نیچے لٹک کر زمین کو چھونے لگے اور اس کا لباس بستر کے گودڑ میں خلط ملط ہو گیا۔ وہ پھر گنگنانے لگی۔

نانا نانا نن نن نانا نن نن نانانانا

مجھ سے پیت نہ کرنا
بانکے
مجھ سے پیت نہ کرنا!

اور پھر آپ ہی آپ :
میں دکھیاری، غم کی ماری،
مجھ سے پیت نہ کرنا!

"گیت بن رہا ہے!" اُس نے اپنے آپ سے سرگوشی کی ——
آپی آپ بنتے جا رہا ہے! مجھ سے پیت نہ کرنا بانکے' —— پر پیت کیسی؟ بانکا کون؟"

وہ گھبرا گئی۔ اُس نے چاہا اُٹھ کر کوئی کام کرے تاکہ یہ پیت اور یہ بانکپن کی باتیں اُس کے دماغ سے بھاگ جائیں۔ وہ اندر سے چھاج اُٹھا لائی اور خالی چھاج پھٹکنے لگی، لیکن چھاج کی 'پٹخ، پٹخ، پٹخ!' نے اُسے پھر کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا! اور وہ گنگنانے لگی۔

مجھ سے پیت نہ کرنا
بانکے
مجھ سے پیت نہ کرنا!
یہ باسی مرجھائی کلیاں، یہ آشائیں میری

بھول کے بھی ان پہ نہ پڑیں گی مست نگاہیں تیری
دم نہ وفا کا بھرنا
بانکے
مجھ سے پیت نہ کرنا!

مسرت آمیز تعجب نے اُس کی سانسیں اُلجھا دیں اُس نے چھاج پرے ہٹا دیا اور پھر اس بند کو کئی بار گنگنایا۔ کھاٹ پہ لیٹ کر چٹکی بجانے لگی اور یہ بند کئی بار الاپا۔ بہت دیر بعد وہ یوں ہی گیت گنگناتی، چٹکی بجاتی، سو گئی ـــ اور جب اُٹھی تو گھناؤنی بیری کے کالے تنے سے کوّے اور چیلیں لپٹی ہوئی تھیں اور اس کے مکان کی چھت پر ایک بلی اپنا بچہ مُنہ میں اٹھائے بھاگی جا رہی تھی۔ اُسے یہ ساری کائنات ایک رس بھرا سپنا معلوم ہونے لگی۔ لیکن گیت کا وہ بند اُسے ازبر تھا۔ اور خوابوں کی باتیں یوں ازبر نہیں ہوا کرتیں!

•

اس روز گاؤں سے باہر ایک کھلی چراگاہ میں گاؤں والے اکٹھے ہوئے۔ سرسوں کے پھولوں کا ایک تخت بنایا گیا جو چراگاہ کے عین وسط میں تھا۔ تمام علاقے سے لوگ جوق در جوق آنے لگے اور جب ڈھول بجنا شروع ہوا، تو عورتیں بھی چراگاہ کو جانے لگیں۔ سیماں اپنے مکان کی چھت پر سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ جب سارا گاؤں خالی ہو گیا تو وہ باہر گلی میں آئی، دیوار کے

سے لگی، ہٹتی، ہچکچاتی گاؤں کی طرف بڑھی، اور جب سامنے دیکھا تو میدان لوگوں سے پٹا پڑا تھا۔ شاعر سرسوں کے تخت پر سے اٹھ رہا تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں اور پھر ایک جگہ آکر رُک گئیں۔ سیماں کو محسوس ہوا کہ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ چراگاہ کے کنارے پر سیماں کے سوا کوئی اور موجود نہ تھا۔ سیماں کے جی میں آئی کہ واپس چلی جائے، بھاگ جائے وہاں سے اور اپنے سنسان گھر میں خوفناک بیری کے تنے کا سہارا لے کر اپنی خیالی دُنیا میں کھو جائے، کیونکہ وہ محسوس کر رہی تھی کہ شاعر اس کی طرف دیکھے جا رہا ہے اُس نے چیتھڑوں میں سے جھلکتے ہوئے اپنے جسم کو ڈھانپنے کی کوشش کی، ایک بار پلٹی بھی! لیکن سب یقینوں کو وہم پر محمول کر کے وہ چراگاہ کی طرف بڑھی اور جب عورتوں کے جمگھٹ میں پہنچی، تو دوشیزائیں اسے تعجب سے گھورنے اور سرگوشیاں کرنے لگیں "اری! سیماں بھی گیت سننے آئی ہے! یہ بھلا کیا سمجھے گی یہ باتیں! چکی پیسنے والی کو گیتوں سے کیا لگاؤ!" — سیماں نے اُن کی سرگوشیاں سُن لیں اور اس کے چاروں طرف رات کا گیت گونج اٹھا، لیکن وہ ان نادان لڑکیوں کو کیسے سمجھاتی، کہ گیت سمجھنا تو ایک طرف رہا وہ تو گیت کہتی بھی تھی اور پھر اس کے گیت میں "پریت" اور کسی "نامعلوم بانکے" کا بھی ذکر تھا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ صرف ان کی پریتیں چھپی رہ سکتی ہیں جن کے پاس پیسہ ہو! اس لئے وہ ان سرگوشیوں سے کان پھیر کر شاعر کی

طرف متوجہ ہوئی ۔ تمام مجمع پر سکوت طاری تھا۔ سورج کی زرد زرد کرنیں آس پاس نیم اور شیشم کے درختوں کی جھولتی ہوئی شاخوں پر کھیل رہی تھیں اور چڑیوں کے غول چہچہاتے ہوئے چراگاہ پر سے گزر رہے تھے۔ شاعر نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ایک گیت گایا جس کا مفہوم یہ تھا کہ :

اے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی نادان حسینہ!
تُو نہیں جانتی کہ تیری رُوح کی گہرائیوں میں
کائنات کے مقدس راز پوشیدہ ہیں!
تُو نہیں سمجھتی کہ تیری ہرن کی سی خوبصورت
آنکھوں میں آفاق کا دل دھڑک رہا ہے!
تُو نہیں جانتی کہ وقت کے قدم تیری
معطر سانسوں کے زیر و بم سے ہم آہنگ
ہو کر اُٹھتے ہیں!
اور تُو نہیں سمجھتی کہ تیرے پریشان کاکلوں
کی پُراسرار ظلمتوں میں کیسے کیسے فردوسی
چراغ ٹمٹما رہے ہیں!
تُو سب سے الگ کیوں کھڑی ہے؟ تُو دیر
سے کیوں آئی ہے؟ تُو کس سوچ میں ہے؟

اِنجان حسینہ!
تُو مجھ سے کترا نہیں، بلکہ میری راتوں پر
اپنی مسکراہٹوں کا مَن برسا! اور جان لے
کہ جو کچھ میں نے تجھ میں دیکھا، وہ کوئی
دُوسرا نہیں دیکھ سکتا!

اے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی نادان ساحرہ!

دم بخود دہقان جو یہ گیت صرف اس لئے سُن رہے تھے کہ وہ اُن کے محبوب شاعر کی زبان سے نکل رہا تھا۔ گیت ختم ہوتے ہی پہلو بدلنے لگے۔ اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور ہونٹ کپکپا رہے تھے اور گو وہ یہ گیت نہ سمجھ سکے، لیکن یہی کیا کم تھا کہ گیت گانے والے کے چہرے کے اردگرد ایک زرّین ہالہ نمودار ہو رہا تھا۔ اُس کی آواز کی کروٹیں زردکرنوں سے دُھلی ہوئی خلاؤں میں عنبر اور لوبان کے خوشبودار دھوئیں کی طرح مست مست بل کھا رہی تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ کائنات کا نظام صرف یہ گیت سُننے کو لمحہ بھر کے لئے تھم گیا ہے!

سیماں کو شک گزرا کہ شاعر نے صرف اُسے مخاطب کیا ہے! آخر 'چیتھڑے' اور 'پردیس سے آنا' اور 'انجان حسینہ' اُس کے گیت میں آپ ہی آپ کیسے آ گئے! لیکن پھر وہ سوچنے لگی کہ گیت رات کی رات نہیں بنائے

جا سکتے، اور وہ خیالی بہشت میں اُڑی پھر رہی ہے۔

اس کے بعد شاعر نے اپنی نقرئی آواز میں کئی گیت گائے: "ایک صحرا میں ایک اکیلا اکیلا پھول تھا" — اور "ایک پہاڑی پہ ایک گونج رہا کرتی تھی جس کا ایک پر ٹوٹا ہوا تھا!" — اور "مسکرا دو نہیں اے شریر ستارو! — مسکرا دو نہیں!" — اور خدا جانے کیسے کیسے گیت، مگر جلد ہی سیتاں کا دل بھر آیا۔ اُس کے دماغ میں جھکڑ سے چلنے لگے۔ شاعر کے گیتوں نے اُس کے احساسات کے اردگرد ایک آگ سی روشن کر دی اور اس کی آنچ سے اُس کا سارا جسم دہکنے لگا۔ گیت ختم ہونے سے پہلے ہی وہ چراگاہ سے بھاگ آئی اور جب گاؤں میں داخل ہوئی تو ہوا کا ایک آوارہ جھونکا چراگاہ سے شاعر کا یہ سریلا بول اُڑا لایا "اُسے اکیلا رہنے دو کیونکہ حُسن خلوتوں میں اپنے پورے شباب پر ہوتا ہے!" وہ سوچنے لگی، کہ شاعر کی ہر بات میں اُس کی طرف یہ اشارے کیسے چھپے ہوئے ہیں اور یہ کیا راز ہے کہ شاعر گیت گاتے ہوئے صرف اُسے دیکھ رہا تھا اور وہ سرسوں کا ایک ہی پھول اور پھر وہ تبسم بھرا لہجہ! کھاٹ پہ گری تو اس کے آس پاس گھنٹیاں سی ٹنٹنانے لگیں۔ ٹنا ٹنا ٹن! ٹنا ٹنا ٹن! اور اُس نے پھر وہی گیت الاپنا شروع کر دیا۔

مجھ سے پیت نہ کر،
بانکے

مجھ سے پیت نہ کرنا!

اُس روز جب وہ ایک زمیندار کے گھر چکی پیسنے گئی تو مغربی افق غبار آلود ہو رہا تھا اور فضا پر ایک منتظر سا سکون طاری تھا جیسے کوئی غیر معمولی بات ہونے والی ہو۔ ایک بار وہ پانی پینے کے لیئے چکی والے کمرے سے باہر آئی تو آسمان پر ابر گھر آیا تھا اور صحن میں نیم کی جھکی ہوئی شاخیں تیز ہوا کی وجہ سے کمانیں بن کر آسمان کی طرف اُٹھ اُٹھ جاتی تھیں۔ شام قریب آچکی تھی اور اُس کی چنگیر میں ابھی تھوڑی سی گندم باقی تھی۔ ایک کر وہ اندر گئی، ہتھی کو مضبوطی سے تھام کر پاٹوں کو اس شدت سے گھمایا کہ آٹا سفید غبار سا بن کر اُس کے ارد گرد اڑنے لگا اور اُس کے بالوں کی تا بانیاں سنولا سی گئیں۔ وہ اب خواب دیکھنے کے اس دور میں پہنچ چکی تھی جب چکی کی گھمر گھمر کوئی اور تان چھیڑ دیتی تھی کہ اُسے باہر زمیندار کی بہو بیٹیاں باتیں کرتی دکھائی دیں۔

سیماں نے چکی روک لی۔

"اری! اُس نے تو ابھی تک شادی نہیں کی، عورت کی طرف دیکھنا بھی پاپ سمجھتا ہے وہ۔ بس بیت کہتا ہے اور مگن رہتا ہے!"

"شعر کہنا اور مگن رہنا اور بات ہے پر بی بی۔ اُس کی آنکھیں بڑی خطرناک ہیں۔ کبھی کبھی پلکیں اٹھاتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے برسوں کا

بجُود کا ہے!"

"اُوئی ری، کیسی کُھلی بات کہہ دی! کوئی سُن پلئے تو کیا کہے! چراگاہ میں آج جب اُس نے گیت گائے تو اُس کے چہرے پر کیسا نُور آگیا تھا! اُس کے ہاتھ یُوں ہلتے تھے، جیسے ــــ جیسے وہ ستاروں کو حکم دے رہا ہے کہ زمین پر اُتر آئیں اور خاک کے ذرّوں سے کہہ رہا ہے کہ وہ اُوپر اُڑ کر آسمانوں کو ڈھنا دیں!"

"چار کتابیں کیا پڑھ لیں، سارے جہان کا علم ہضم کر ڈالا! انسان اور تاروں پر حکم چلائے، عقل کے ناخن لو۔"

"پر وہ رہتا کس کے گھر ہے؟"

"گاؤں کے پورب میں جو اُجڑا سا ٹیلا ہے نا۔ اُس کے درے تم نے ایک کھنڈر سا دیکھا ہوگا، جہاں اُس روز اُلّو بولا تھا۔ اور تم نے کہا تھا، یہاں کوئی آفت ٹوٹے گی!"

"کہاں؟"

"اری وہ نالے کے اُس طرف گارے سے تھوپا ہُوا گھروندا جس کا گارا کب کا گر چکا ہے اور اب پتھروں کا انبار دِکھتا ہے دور سے!"

"ہاں ہاں۔"

"بس وہیں ــــ کہتے ہیں وہ اجاڑ جگہ رہنا زیادہ پسند کرتا ہے

اور کہتا ہے اُسے لالٹین والٹین کی بھی ضرورت نہیں بس مٹی کا میلا سا دیا ہو اور بس ـــ وہ رات بھر گیت بناتا رہے گا اور پھر آج تو ابھی گھر آیا ہے۔ کہتے ہیں یہ گیت بنانے والے بوندیاں پڑتے ہی قلم اُٹھا لیتے ہیں اور ساری ساری رات ـــ ارے! یہ تو بوندیاں گرنے لگیں!"

اور اندر سیماں کے تپتے ہوئے دماغ پر جیسے کسی نے خنک پھوار کی یا مٹھی چھڑک دی۔ "اچھا تو ٹیلے کی پرلی طرف کا کھنڈر جہاں الّو بولتے ہیں ـــ وہاں رہتا ہے یہ عجیب و غریب شاعر ـــ یہ انوکھا اجنبی!"

آبادی، دوپٹہ لپیٹتی وہ گھر کی طرف لپکی۔ گھر آتے آتے تک بھیگ گئی، چکبٹ چولا جسم سے چمٹ گیا۔ میلا لہنگا ہر قدم پہ چپڑ چپڑ بجنے لگا۔ گھر آ کر اُس نے پرسوں کی خریدی ہوئی کھجور کھائی اور کواڑ کھول کر دیر تک آسمان کی طرف دیکھتی رہی۔ باہر مینہ کے جھالے پڑ رہے تھے۔ صحن میں بیری کے درخت کا پتہ پتہ دم بخود کھڑا تھا اور ٹھنڈا سیلا وقت بول رہا تھا!

"ٹیلے سے پرے جہاں الّو بولتے ہیں!" ـــ اُس کے کان میں سرگوشی ہوئی اور وہ کواڑ بند کرنا بھول گئی۔ گلی سے نکل کر وہ گاؤں کے باہر آ گئی۔ ہوا بہت تیز تھی۔ بجلی کی چمک سے سنسناتا ہوا اندھیرا غائب ہوتا تو وہ سمٹ کر بیٹھ جاتی اور یونہی گرتی پڑتی جب وہ ایک بار بجلی کی چمک سے ڈر کر ٹھٹک گئی تو اُس کی مٹھیوں میں ریت بھر گیا۔ "ٹیلا!" اُس نے زیرِ لب یہ لفظ

کچھ ایسی شدت سے کہا کہ اگر خاموشی ہوتی تو گاؤں کے کتے اس جھنکار سے بھڑک اُٹھتے۔ جب وہ ٹیلے پر چڑھی تو اس کا لباس بُری طرح پھڑپھڑانے لگا۔ اُسکے بال اس کی گردن سے چمٹ گئے اور اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا جیسے ساز چھیڑا جا رہا ہے۔

کھنڈر میں سے مدھم مدھم روشنی باہر آ رہی تھی وہ ہولے ہولے کھسکتی کھنڈر تک پہنچی اور جب اُس کی دیوار کو چھوا تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس نے پُراسرار شاعر کو چھو لیا ہے۔ رگ و پے میں کئی خوابیدہ تار جھنجھنا اُٹھے، بارش جیسے تھم گئی اور آسمان کے بھیگے جھروکوں سے جیسے کئی حسین حوریں یہ البیلا ناٹک دیکھنے لگیں!

اُس کا ایک قدم اُٹھتا تو چکی کے پاٹ ہزار دفعہ اس کے دماغ میں گھوم جاتے اور پھر جب اُس نے سامنے دیوار میں مٹی کا ایک دیا بھی دیکھا جس کی زرد لَو کے ارد گرد بے شمار پتنگے گھوم رہے تھے اور جس کی نوک سے دھوئیں کی ایک مبہم سی سیدھی لکیر نکل کر کئی بل کھا جاتی تھی تو اُس کی آنکھیں جل اُٹھیں اور پلکوں پہ اٹکی ہوئی بوندیاں چنگاریاں بن گئیں اور پھر ــــ!

اور پھر اُس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ دھرا اور آواز آئی ــــ "کون ہے تو؟"

"دیساں۔" اُس نے خوف آلود بھولپن سے کہا۔

"دیساں کون؟" بولنے والا اب اس طرف گھوم آیا اور دیساں نے دیکھا

کہ وہ شاعر تھا جس نے چراگاہ میں میٹھے میٹھے گیت گا کر فضا میں عطر چھڑک دیا تھا۔ اُس کے لمبے بالوں سے پانی کے قطرے اس کے شانوں پر گر رہے تھے۔ اُس کا لباس تر بتر تھا اور اُس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔

"کون سیماں ؟" اُس نے پھر پوچھا۔

اور سیماں گھبرا کر بولی "سیماں — چکی پیسنے والی ؟"

اور شاعر کے ہونٹوں پہ ایک مقدس مسکراہٹ کھیلنے لگی اُس نے کچھ سوچ کر آسمان کی طرف دیکھا اور کھنڈر میں جاتے ہوئے بولا — "اندر آ جا سیماں!"

"جی بس، میں اب جاتی ہوں۔" سیماں بے بس ہو کر بولی۔

"لیکن یہاں آئی کیسے ؟"

"رستہ بھول گئی تھی۔"

"کہاں جانا تھا تجھے ؟"

"جی معلوم نہیں کہاں جانا تھا۔"

"یعنی تیرا گھر ہے ؟"

"جی، گھر تو ہے میرا۔"

"مجھے پہچانتی ہے ؟"

"ہاں جی۔ تم شاعر ہو۔"

"تُو نے میرے گیت سُنے ؟"

"جی سُنے ۔"

"اچھے تھے ؟"

"جی اچھے تھے ۔"

"پسند آئے ؟"

"اچھے جو تھے جی — اچھی چیزیں ہی پسند آتی ہیں ۔"

"تو پھر — لیکن تُو اندر کیوں نہیں آجاتی !"

سیماں سمٹتی ہُوئی اندر چلی آئی اور بے کواڑ کے دروازے پر بیٹھ گئی ۔ شاعر ، جس کے سر کا سایہ اب سیماں کے چہرے پر پڑ رہا تھا ، ایک طرف ہو گیا اور سیماں لجا گئی ۔ گالوں پر چمٹے ہُوئے بالوں کو الگ کیا ، بھیگے ہوئے لباس کو گھما کر سینے پر چیتھڑوں کا ایک انبار سا لگا دیا اور باہر بجلی چمکی ۔ بادل گرجا اور کھنڈر کی بنیادوں میں ڈھول سے بج اُٹھے ۔

"سیماں" شاعر بولا "سیماں بی ! مجھے یہ تو بتا کہ تُو یہاں آئی کیسے ؟"

"سچ سچ کہوں ؟" وہ اپنے پاؤں کا انگوٹھا گھورتی ہوئی بولی ۔

"ہاں ہاں ۔"

"بُرا تو نہیں مانو گے ؟"

"نہیں نہیں۔"

"تم سے ملنے آئی تھی۔"

"مجھ سے؟"

"اور کس سے؟"

"کیوں؟"

"تم نے جی! آج بڑے پیارے گیت سنائے. تم نے جو دوہے گائے، وہ اب تک میرے دماغ میں گھوم رہے ہیں. تم نے جو بَیت اُلاپے انھیں میں کبھی نہ بھولوں گی۔ تم بہت بڑے آدمی ہو شاعر! تم بہت اُونچے ہو! میں چکّی پیسنے والی ہوں، چیتھڑے پہنتی ہوں، میرے گھر کے آنگن میں جو درخت ہے، اُس کی شاخوں میں پتّے ہی نہیں آتے۔ مجھے عرصے سے جُوتا پہننا بھی نصیب نہیں ہُوا۔ پر شاعر! تم مجھے اچھّے لگے۔ اس لئے تم سے ملنے چلی آئی۔ مجھے بس اتنا بتا دو! کہ تم یہ دوہے کیسے کہتے ہو؟"

شاعر جو کھنڈر کے وسط میں بے حس و حرکت کھڑا تھا، فرش پر بیٹھ گیا، اور بولا "تو نے بہت سی باتیں ایک سانس میں کہہ دیں، اور پھر تیرا یہ سوال بڑا عجیب ہے کہ میں دوہے کیسے کہتا ہوں۔ سُن! جب میں دوہے کہنے لگتا ہوں تو میرے دل کی خاموشیوں میں پہلے ایک ساز بجتا ہے، بڑا

میٹھا اور پیارا ساز! ایسے ساز اس دُنیا میں نہیں بجا کرتے۔ میری رگوں میں ساز کے تاروں کی من موہنی جھنجھناہٹیں تیرنے لگتی ہیں، میں اس زمین پر سے اُوپر اُٹھ جاتا ہوں، میں نے کئی بار زمین سے اُبھر کر تاروں کو چھُو لیا ہے اور پھر جب میں تاروں کی اُجالوں بھری دُنیا میں پہنچتا ہوں تو بے شمار خوبصورت پرچھائیاں میرے اردگرد آکر ناچتی ہیں۔ سُنا؟ دیر تک ناچتی رہتی ہیں، اِدھر میرے دل میں ساز کی جھنکار، اُدھر پرچھائیوں کا رقص، اور ستاروں کی تھرتھراہٹیں، دوہا خود بخود بننے لگتا ہے اور جب ساز کی آواز بند ہو جاتی ہے تو رقص بھی ختم جاتا ہے، تارے بھی دھندلا جاتے ہیں اور میں ایک نیا دوہا الاپنے لگتا ہوں۔"

"پر شاعر!" مبہوت سیماں بولی "میں تاروں تک کیسے اُبھروں؟"

"تو نے کبھی کوشش بھی کی ہے اُبھرنے کی؟"

"جی کی تو ہے، اور ایک گیت بھی شروع کیا ہے۔"

"سُنا تو۔"

"ختم کر لیا تو سُناؤں گی۔"

"کیسا ہے؟"

"یہ تمھیں معلوم ہو جائے گا لیکن اگر میں تمھیں اس وقت کہوں کہ کوئی دوہا بناؤ تو بنا سکو گے؟"

"ہاں۔"

"لیکن تم کھنڈر کے فرش پہ بیٹھے ہو اور گیت بنانے کے لئے تمھیں تاروں کی طرف جانا پڑتا ہے اور پھر آج تم اُبھر بھی تو نہ سکو گے۔ ابر چھارہا ہے، تاروں کا نشان تک نہیں ملتا۔"

"میں اس وقت تاروں کے اُجالوں بھرے دیس ہی ہوں۔"

"کیسے؟"

"تُو نہیں سمجھ سکے گی۔"

"اچھا تو کوئی دوہا کہو۔"

اور شاعر کی نقرئی آواز نے بارش کی سنسناہٹیں اپنے اندر جذب کر لیں:۔

"سبحان اللہ! یہ آنکھیں اس قدر خوبصورت ہیں جیسے
پَو پھٹنے سے قبل آسمان پر تارے!
یا دو سیاہ بھونرے جو باغ میں والہانہ اُڑتے پھرتے ہوں!
یا دو لس لس کرتے ہوئے چراغ جو دریا کے اُس پار
ٹمٹما رہے ہوں!
یا میری تقدیر کے دو حرف جو ہر لمحہ اپنی ہار مان رہے
ہوں!

اور جب دوہا ختم ہو چکا تو شاعر سیماں کے قریب ہو کر بولا "یہ دوہا میں نے تیری آنکھوں پر کہا ہے۔"

"جی؟" — اور وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"تیری آنکھیں مجھے اس طوفان زدہ رات میں تاروں کے دیس تک لے گئیں۔"

"جی؟" سیماں باہر جانے لگی۔

شاعر نے اپنی جیب سے ایک سُوکھا ہوا زرد پھُول نکال کر سُونگھا۔

"ارے!" سیماں گھبرا گئی اور کھنڈر سے نکل ٹیلے کی طرف بھاگی اور جب پلٹ کر کھنڈر کی طرف دیکھا تو دِیا بُجھ چکا تھا، بُوندیاں تھم چکی تھیں اور پُوربی اُفق پر دو تارے بھی ٹمٹا رہے تھے — اُس نے اپنی آنکھیں ملیں اور تیز تیز قدم اُٹھاتی گاؤں میں آ گئی اور جب اپنی کوٹھڑی میں قدم دھرا تو فرش کیچڑ بن چکا تھا لیکن اُس کے دماغ میں اُلجھے ہُوئے مختلف خیالات گھوم رہے تھے — میری آنکھیں — تاروں کا دیس — سرسوں کا پھُول — راز بھرا شاعر — اور — اور — یہ سب کیا ہے؟ اُس کے سامنے دھوئیں کا ایک گول مول سا غبارہ گھومنے لگا، اور جب گھر پہنچی تو اُس نے نانا نانا نن نن تانا کی دُھن پر ایک اور بند کہا:

تُو تاروں میں بسنے والا، عرش پہ رہنے والا

میرے سر پہ پھٹا پرانا میلا سا دوشالا
سورج کے پاؤں دھرنا
بانکے
مجھ سے پیت نہ کرنا!

شاعر نے اس کے بعد چراگاہ میں بے شمار لوگوں کے درمیان لاتعداد گیت گائے اور سیماں لڑکیوں میں چھپ چھپ کر انھیں سنتی رہی اور جب گھر آتی تو آئینے کے ایک میلے سے ٹکڑے میں اپنا عکس دیکھتی رہتی اور اُسے یقین ہو جاتا کہ شاعر نے سب گیت اُسی کے متعلق کہے ہیں۔ اُس کی آنکھیں بالکل روشن ستاروں کی طرح ہیں، اُس کے بال بالکل گھٹاؤں ایسے ہیں، اس کے ہونٹ بالکل نودمیدہ پنکھڑیاں ہیں، اُس کی چال میں مستی اور آواز میں ترنم ہے اور شاعر ہر گیت ہر دوہے میں یہی باتیں دُہراتا ہے۔ ”اچھا شاعر — پیارا موسیقار!“

لیکن وہ اس کھنڈر کی طرف پھر کبھی نہ گئی، کیونکہ اُسے خوف تھا کہ شاعر اُس کے بالوں کی تعریف میں کوئی دوہا کہہ دے گا اور وہ شرما جائے گی۔

اُس کے سینے میں اُمنگوں کا ایک طوفان بپا تھا۔ کہاں چاند کہاں خاک کا حقیر ذرّہ! بڑی انوکھی بات ہے لیکن سیماں کو یقین تھا، کہ شاعر اسے بھولے گا نہیں۔ وہ اس کے پاس آئے گا اور پھر ہمیشہ کے لئے اُس کے

ہاں رہے گا، وہ دونوں رات کی خاموشیوں میں سُنسان ٹیلوں سے ورے کھنڈروں میں چھپ کر ستاروں کے اُجالوں بھرے دیس میں اڑ جائیں گے، گیت بنائیں گے، دوہے گائیں گے، نہ یہ چکی کی منحوس کھسر پھسر ہو گی، نہ یہ ڈراؤنا درخت نہ یہ کمبخت بڈھا ___ اور اگر یہ بات نہیں تو شاعر نے سرسوں کا پھول اپنی جیب میں کیوں محفوظ رکھا؟ سیماں کی آنکھوں پر اُس نے دوہا کیوں کہا! وہ سب باتیں سوچتی اور اس حد تک سوچتی کہ اکثر شاعر کا خیالی ہیکر اس کے قریب آکر گنگناتا۔

سبحان اللہ! یہ آنکھیں اس قدر خوبصورت ہیں جیسے ....

اُس نے ان دنوں میں گیت ختم کرنے کی کوشش کی اور ایک بند اور بھی بنا لیا۔

ساون رُت ہے تیری سہیلی۔ دھوپ مری بہنیلی
ساون کی اندھیاری رُت میں دھوپ کا انت پہیلی
مجھ پر دوش نہ دھرنا
بلکے
مجھ سے پیت نہ کرنا!

لیکن اُس نے محسوس کیا کہ گیت ہنوز اُدھورا ہے، اور پھر ایک صبح کو جب وہ اُٹھی تو یہ ارادہ کر کے کہ آج رات وہ پھر کھنڈر کا چکر لگائے گی، دیکھے تو ہی

کہ اس کے خوابوں کا راجہ کس رنگ میں ہے، اُس نے لاکھ سر پٹخا کہ گیت مکمّل کر لے، تاکہ رات کو شاعر کے پیش کر سکے، لیکن ناکام رہی اور شام کو جب وہ ایک گھر میں چکی پیس رہی تھی، تو اُسے خیال آیا کہ شاید یہ گیت شاعر ہی مکمل کر دے۔ یہ خیال آتے ہی وہ اُچھل پڑی اور زیر لب گیت گنگنا نا چاہتی تھی کہ گاؤں کی ایک بوڑھی کھوسٹ بھٹیارن لاٹھی ٹیکتی آئی اور اس کے کانوں کے قریب اپنے ٹھنڈے مُرجھائے ہوئے ہونٹ لاکر بولی "سیماں بیٹی!"

سیماں نے چونک کر چکّی روک لی "کہو خالہ!"

"چکّی گھمائے جاؤ، سیماں بیٹی!" بوڑھی اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی "بڑے راز کی بات ہے۔"

چکّی کی گھمر گھمر میں سیماں نے پوچھا "لو اب کہو!"

"وہ جو شاعر آیا تھا نا ہمارے گاؤں میں۔ وہ آج چلا گیا ہے۔"

"چلا گیا!" سیماں نے چکی روک لی۔

"چکّی گھمائے جاؤ بیٹیا!۔۔ وہ چلا گیا ہے، وہ کھنڈر میں تمہارا منتظر رہا، مگر شاید تمھاری ہمّت نہ پڑی۔ تم نہ جا سکیں۔ آج اُس نے مجھے بُلا کر دس روپوں کا یہ نوٹ دیا، اور کہا کہ یہ سیماں کو دے دینا اور کہنا کہ وہ یہاں سے لاری پر سوار ہو کر اسٹیشن پہنچے اور وہاں سے گاڑی پر سوار ہو کر

اس کے ہاں آجائے۔ اگر تم کل صُبح یہاں سے روانہ ہوجاؤ تو وہ پرسوں صُبح تمھیں اسٹیشن پر ملے گا۔ وہ کہتا تھا کہ تم اُس کے گیتوں کی ملکہ ہو اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا تھا کہ دیر نہ کرنا — اور پھر یہ پھُول بھی دیا تھا اُس نے نشانی کے طور پر!"

سیماں نے جھپٹ کر بڑھیا سے پھُول چھین کر مسل ڈالا۔ دس روپوں کا نوٹ اُس کی مُردہ مٹھی میں گھسیڑ کر بولی: "تُو اب جا خالہ بی! ورنہ چکّی کے پاٹ سے سر پھوڑ دوں گی تیرا — کاٹ کھاؤں گی تجھے!"

بڑھیا لاٹھی ٹیکتی چلی گئی اور سیماں نے اس زور سے چکّی گھمائی کہ آٹا آندھی کی طرح اُٹھ کر سارے کمرے میں پھیل گیا۔ ایک بار ہتھی اکھڑ گئی، سیماں پیچھے گر گئی، چکّی کا پاٹ کھسک کر آٹے میں دھنس گیا اور سارے گھر والے اکٹھے ہو کر اُس پر برس پڑے!

اور پھر اُس رات جب وہ کھنڈر کے قریب پہنچی، تو گیت مکمل کر لیا اور ٹیلے پر بیٹھ کر آخری بند گنگناتی رہی۔

میری نیّا طوفانوں میں پھنس کر غوطے کھائے
تُو ساحل پر بیٹھا مجھ کو اپنے پاس بُلائے
مشکل پار اُترنا
بانکے
مجھ سے پیت نہ کرنا!

لیکن اُس نے محسوس کیا کہ گیت ابھی اَدھورا ہے اور ہمیشہ اَدھورا ہی رہے گا!

حیوان اَور اِنسان

زہرہ اور میں دالان کے ایک کونے میں چکنی مٹی کے زیور بنا رہے تھے اور آپا جان ایک بڑے سے ٹوکرے کو ایک کنارے پہ کھڑا کئے اور اس کے اُوپر کے سرے پہ ایک لمبی سی رسّی باندھے مکان کے اندر کواڑ کی اوٹ میں بیٹھی تھیں۔ ٹوکرے کے نیچے دانے بکھرے پڑے تھے۔ آپا جان شاید چڑیا کا شکار کھیل رہی تھیں۔

میں نے مٹی کا ایک ہار تیار کیا اور اُسے سَن کے دھاگے میں پرو کر زہرہ کے گلے میں ڈال دیا۔ زہرہ کے گلابی رخساروں سے جیسے خون پھوٹ نکلے گا، لجا گئی۔ بولی "بہت گندہ ہار ہے۔"

میں نے کہا "میری انگلیوں کی پوروں میں آبلے اُبھر آرہے ہیں اور تم....."

وہ ہنس دی — اُسے ہار پسند تھا اور میری غلو آمیز تقریر بیکار تھی!

زہرہ نے مٹی کی ایک انگشتری تیار کی جس میں نگینے کی جگہ سبز کانچ کی چوڑی کا ایک ٹکڑا جڑ دیا۔ اور میری اُنگلی تھام کر بولی "یہ لو اپنے ہار کی قیمت۔"

میں نے کہا "بہت گندی انگشتری ہے۔"

وہ بولی" انگشتری بناتے بناتے میرے ہاتھوں میں — "
میں زور سے ہنس دیا۔ اس نے انگشتری سرکائی۔ انگلی کے پہلے جوڑ پر پہنچ کر اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک نیچے گدلے پانی میں جا گرا اور دوسرا زہرہ ہی کے ہاتھ میں رہ گیا۔ گھبرا کر کچھ کہنا چاہتی تھی کہ "خپ!" کی آواز آئی۔

آپا نے چڑیا پکڑ لی تھی!

ہم دونوں بھاگے بھاگے ٹوکرے کے پاس پہنچے۔ آپا کبھی ٹوکرے کے اس طرف اکڑوں بیٹھ جاتیں۔ کبھی اس طرف دب کر زمین سے لگ جاتیں۔ ہاتھ ملتے ہوئے اور کسی دراز سے اندر جھانکتے ہوئے کہتیں "اب کیسے نکالا جائے اسے ؟ ہاتھ کون ڈالے اندر ؟ اُڑ نہ جائے پھر سے!"

میں نے کہا "زہرہ! ذرا ہاتھ ڈالو ٹوکرے کے اندر۔ میں ذرا —"

بات کاٹ کر بولی "اونھوں۔ ہم کیوں دوسرے کا پاپ اپنے سر لیں۔ اور پھر مایوس چڑیا ہاتھ پر ٹھونگا لگا بیٹھی تو پہروں رونا پڑے گا!"

آپا بولیں "بزدل!"

زہرہ نے میری طرف اس بے گناہ کی طرح دیکھا جس پر قتل کا الزام بغیر کسی ثبوت کے تھوپا جا رہا ہو۔ تن کر بولی "میں بزدل ہوں اور تم ؟ تم

دکن والی چاندنی بی ہو! ہے نا ؟"

معاملہ بڑھ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ ڈال کر چڑیا پکڑلی۔ زہرہ چیخ اٹھی "اے ہے یہ تو ہمارا چڑا ہے! ہمارے باورچی خانے میں رہتا ہے۔ بڑا بھلا مانس ہے۔ گندے برتنوں کے سوا اور کہیں چونچ نہ مارے گا۔ برسوں سے ہمارے یہاں رہتا ہے۔ دیکھو تو دُھواں کھاتے کھاتے دھندلا سا گیا ہے بیچارا! چھوڑدو اسے۔ ہماری چڑیا رانڈ ہو جائے گی۔"

آپا جان بولیں: "ارادہ تھا کہ گڑیوں کے بیاہ میں اس کے گوشت سے دعوتِ ولیمہ تیار کی جائے مگر تمھارے کہنے پر اسے چھوڑ دیتی ہوں ـــ یہ کیا یاد کرے گا کہ کسی کے گھر سے چوری چھپے دانے چگنا اور کسی بچی کی خوبصورت گڑیا کی آنکھ کو باجرے کا دانہ سمجھ کر اس میں چونچ چبھو دینا کتنا بڑا جُرم ہے!"

چڑا میری اُنگلیوں میں جکڑا ہوا یُوں آنکھیں گھما رہا تھا جیسے سب کچھ سمجھ رہا ہے۔ اسے میرے ہاتھ سے چھین کر آپا اندر بھاگ گئیں اور دروازہ بند کر دیا۔ ہم نے بند مٹھیوں سے کواڑ کوٹ دیئے مگر نہ جانے اندر چڑے پر کیا بیت رہی تھی کہ اچانک اندر سے دردناک "چیں چاں چوں" کی مُسلسل آوازیں آنے لگیں اور کچھ دیر کے بعد آپا کا ایک بلند قہقہہ! ہم دونوں حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"آپا — !" میں نے چیخ ماری۔

"عابدہ !" زُہرہ پکاری۔

"کھولتی ہوں۔ کھولتی ہوں" — اندر سے آواز آئی۔ دروازہ کھُلا چڑے میاں کے سر پر سُرخ رَیشم کا ایک پھُول سج رہا تھا اور اُس کی ننھی سی لکھوپڑی پر خُون کے دو قطرے چمک رہے تھے۔

زہرہ غم و غصّہ سے بے تاب ہوکر بولی "کیا تم سُوتی سے — !" — اور اچانک چڑا پھُر سے اُڑا، بیری پر سے ہوتا شبنمی پر سے گزرتا مسجد کی میناروں کی طرف غائب ہو گیا۔

اُس دن سے چڑے نے زہرہ کے گھر سے اپنا آشیانہ اُٹھا لیا اور شاید کہیں ویرانے میں جا بسا۔ آدم کی ندیدی اولاد سے ڈر کر اُس نے بن باس کی ٹھان لی۔ ہمیں وہ بہت عرصے تک کہیں دکھائی نہ دیا۔

اور آخر چار مہینے بعد میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہی چڑا ہمارے باورچی خانے کی چھت میں گھونسلا بنانے کی کوشش میں ہے، رنگ نکھرا ہوا، لیکن سر کا پھُول میلا اور پچکا ہوا تھا۔ میں بھاگ کر زہرہ کو بُلا لایا۔ یہ پڑوس ہی میں رہتی تھی۔

زہرہ کے تو جیسے پَر لگ گئے۔ باورچی خانے میں آئی تو چڑا اُڑ کر باہر اُڑ گیا۔ زہرہ نے تالی پیٹ کر کہا "چڑیا کرلینے گیا ہے !"

میں بولا "اس بوڑھے کے ساتھ کون آئے گی ! کوئی بوڑھی کھوسٹ

گھسی ہوئی چونچ والی، پھٹی ہوئی دُم والی، اُترے ہوئے پنجوں والی بھینگی ڈوبی چڑیوں کی دادی اماں کہیں سے اُٹھا لائے گا۔"

زہرہ ہنسنے لگی "کلغی والے کو اپنی کلغی کا احساس تو ضرور ہوگا نا۔"

اور واقعی غروبِ آفتاب سے چند لمحے پہلے وہ ایک چڑیا ہمراہ لے آیا، دُودھ کی طرح سفید سینہ، شبنم کے قطروں کی سی آنکھیں، سونے میں ڈھلے ہوئے پنجے، ریشم سے بنے ہوئے پَر۔ یوں چوں چوں کرتی تھی۔ جیسے دُور کوئی جلترنگ بجا رہا ہو۔ کچھ دیر باہر منڈیر پر بیٹھے رہے، پھر اندر آ گئے اور چھت میں شہتیروں کے آس پاس یوں سمٹ گئے جیسے مستری نے اُنہی کے لئے یہ جگہ خالی چھوڑ دی تھی۔

دو سال وہ ہمارے یہاں رہے۔ گرمیوں میں باہر روشن دانوں میں آ جاتے، سردیوں میں اندر شہتیروں کے آس پاس گھس جاتے۔ ہم سے یوں ہل گئے کہ ایک بار زہرہ نے عابدہ کے کہنے پر چڑے کو پکڑ لیا اور اُس کے سر کا پھول تازہ کرنا چاہا مگر وہ دردناک انداز میں چیخ اُٹھا۔ اوپر سے چڑیا جس کا رنگ باورچی خانے کے دھوئیں سے میلا پڑ گیا تھا چیختی ہوئی اُڑی اور منڈیر پر بیٹھ کر ہمیں گھورنے لگی۔ ہم نے چڑے کو چھوڑا۔ تو وہ سیدھا اپنی بیگم کے پاس جا بیٹھا اور اُس نے پھدک پھدک کر یوں رازدارانہ انداز میں چخ چخ کر جیسے کہہ رہا ہے "پگلی! تو کیوں چیخ

اُٹھی، ہم دو سالوں سے ان کا نمک کھا رہے ہیں، یہ ہمیں گز ند نہیں پہنچائیں گے۔ پگلی!" ــــ "میں سمجھی تھیں مروڑ ڈالیں گے۔ اللہ قسم میں ڈر گئی تھی!" ــــ "اوہو! پگلی!"

میں باہر سیر پر جاتا اور وہ چڑا کہیں نظر پڑتا تو میں پکار اُٹھتا "وہ رہا۔ وہ رہا ہمارا چڑا!" ــــ میرے ساتھی زور زور سے ہنستے ہوئے کہتے "کیا دماغ چل گیا ہے تمہارا! سارے شہر میں تمہارے چڑے کے تذکرے ہیں۔ ایک تو بے چارے کا سر چھید ڈالا، اوپر سے اتنا بدنام کیا کہ بچے اُسے آنگنوں میں چین سے پیٹ تک نہیں بھرنے دیتے۔ اگر کسی شریر چھوکرے کے ہتھے چڑھ گیا تو کلغی کھینچ کھانچ کر چھچھوندر بنا دے گا تمہارے چڑے کو!"

اور میں بھڑک کر کہتا "کوئی چھیڑے تو میرے چڑے کو قسم خدا کی اُلٹا لٹکا دوں گا سٹیشن کے پل سے!"

زہرہ کی بھی یہی حالت تھی۔ سہیلیوں میں بیٹھی کشیدہ کاڑھ رہی ہوتی، پکار کر کہتی "وہ رہا ہمارا چڑا!"

سہیلیاں ٹھوڑی پر اُنگلی رکھ کر کہتیں "اے ہے! ربنے بھی دے، ہمارا چڑا۔ ہمارا چڑا ــــ کوئی سُن پائے تو کہے زہرہ چڑے سے بیاہ رچانے والی ہے!"

اور زہرہ کڑک کر کہتی "منہ سنبھال کر بات کرو بھئی!۔۔ کوئی دکھائے تو ایسا پیارا چڑا۔"

سہیلیاں زور زور سے ہنستیں۔ فضا میں نقرئی قہقہے پھلجھڑیاں کی طرح بکھر جاتے، اور چڑا مبہوت ہو کر وہاں سے اُڑ جاتا۔

ایک روز چڑا اور چڑیا برآمدے کے باہر چوبی کٹہرے پر بیٹھے تھے، اچانک چڑیا پھدکتی ہوئی آئی اور چڑے کے سر کے پھول میں چونچ پھیرنے لگی۔ چڑا آنکھیں بند کیے ہوئے دم بخود بیٹھا رہا۔ جب یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا تو میں تیزی سے اُٹھا کہ زہرہ کو بلا لاؤں اور اُسے یہ اچھوتا منظر دکھاؤں کہ اچانک عابدہ بولی "بھیا امی بلا رہی ہیں!"

میں پلٹ کر اندر کمرے میں گیا۔ امی نے مجھے اپنے قریب بٹھا کر کہا:

"کدھر چلے تھے؟"

"زہرہ کو بلانے۔"

"کیوں؟"

"چڑے چڑیا کا کھیل دکھانے۔"

"کیوں؟"

"یونہی۔"

"تم اب دودھ پیتے بچے نہیں بیٹا! اللہ رکھے گبھرو ہو، سوچ سمجھ

سکتے ہو، یہ بھی جانتے ہو کہ زہرہ کے ماں باپ سے ہم تمھارے متعلق بات چیت کر رہے ہیں، اب تم اس کے ساتھ بچوں کی طرح کھیلنا چھوڑ دو، کل اُس کی ماں بھی یہی کہہ رہی تھی، تمھارا اُدھر جانا ٹھیک نہیں، لوگ ہنستے ہیں!"

میں سر جھکائے باہر آیا تو عابدہ دوپٹے میں ناک چھپائے دیوار سے لگی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھا تو بولی "کیوں بھائی جان! کیا حال ہے؟"

اندر سے امّی پکاریں: "عابدہ! تو بھی اپنے بھائی کی طرح بچہ ہی ہے، چُپ رہ۔"

اور میں نے عابدہ سے پوچھا "کیوں آپا جان! کیا حال ہے؟" — ہم دونوں ہنسنے لگے۔ مگر میری ہنسی کھوکھلی تھی، جیسے خالی پیٹ بجتا ہے۔

میں نے بہت دنوں تک زہرہ کو نہ دیکھا۔ اور ایک رات جب چاند اُفق کو مس کر رہا تھا، دُکھی دُکھی چاندنی فرطِ غم سے سمٹی جا رہی تھی، میں نے زہرہ کو گلی کے نکڑ پر مڑتے دیکھا۔ لپک کر اُس کے پاس پہنچا۔ اُس کے بال جو دھوئے جانے کے بعد گوندھے نہیں گئے تھے، اُس کے نصف چہرے کو چھپائے ہوئے تھے اور اُس کے ہونٹوں کے کنارے پل پل بھر کپکپا اُٹھتے تھے۔

میں نے اُسے ساتھ ساتھ آنے کا اشارہ کیا تو وہ فرماں بردار شاگرد کی طرح میرے پیچھے پیچھے ہولی ۔ شدّت کے جاڑے میں بھی وہ پسینے میں شرابور تھی ، چاند کی غمگین روشنی جو اس کے چہرے پر پڑی تو میں سمجھا کہ بابل یا نینوا کی کوئی شاہزادی حاجبوں کی نظروں سے کترا کر کسی چور دروازے سے نکل آئی ہے اور اپنے محبوب کو ملنے آئی ہے !

ہم چھت پر ٹھٹھرتے ہوئے جا بیٹھے۔ میں نے کہا" زہرہ ! نہ یہ شکریہ ادا کرنے کا موقع ہے نہ چھوٹے چڑیا کی باتیں کرنے کا ۔ میں صرف یہی کہنا چاہتا ہوں کہ اب وہ دن بیت گئے ، جب ہم مٹی کے زیور بناتے تھے چڑیوں کے پیچھے بھاگتے تھے ، رنگ رنگ کی تتلیاں پکڑتے تھے نہ کوئی روکنے ٹوکنے والا ، نہ کوئی پوچھ گچھ کرنے والا ۔ اور اب یہ حالت ہے کہ ہمارا ایک دوسرے کو دیکھنا بھی گناہ سمجھا جاتا ہے ۔ میں نے سُنا ہے کہ شہر کے ایک اور صاحب بھی اپنے بیٹے کے لئے تمہارے ماں باپ سے . . . . تمہارے متعلق بات چیت کر رہے ہیں ۔ زہرہ ! کیا تم برداشت کر لوگی کہ ہم الگ الگ پھینک دیئے جائیں ؟ ہم بچپن سے ایک ساتھ رہے ہیں ۔ اس لئے میں زہرہ کے حسن کا اتنا پجاری نہیں جتنا زہرہ کا ، وہی زہرہ جس نے میری انگلی میں ـــــ مدتیں گزریں ـــــ مٹی کی ایک انگوٹھی ڈالی تھی ۔"

"اور وہ ٹوٹ گئی تھی!" زہرہ پہلی بار بولی۔ جیسے کسی نادان بچے نے بے جانے بوجھے سارنگی کے کسی تنے ہوئے تار کو چھیڑ دیا ہو"۔ میں گھبرا گیا۔

زہرہ پھر بولی: "تم چُپ ہو گئے۔ بات یہ ہے کہ اس قسم کی قربانیاں کرتے وقت مرد سے زیادہ عورت کی رُوح پر چرکے لگتے ہیں، وہ پنجرے میں بند ایک چڑیا ہے، نکل نہیں سکتی، اور کسی رخنے سے نکلے گی تو اپنے پر زخمی کرے گی، اور پھر اُڑنے کے ناقابل ہو جائے گی، رینگے گی اور تم جانتے ہو! صرف رینگنے سے چڑیاں آشیانوں میں نہیں پہنچ سکتیں۔"

"پر پھر بڑھ آتے ہیں" میں نے کہا۔

"پروں کے بڑھنے کا انتظار کون کرے!" زہرہ نے اپنا خوبصورت سر اِدھر اُدھر ہلاتے ہوئے کہا "کوئی نہیں کرتا۔"

کنول کے پھول کے سے نرم اور بھیگے بھیگے ہاتھ کو میں نے اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا "یہ چڑا اور چڑیا جو ہمارے باورچی خانے میں رہتے ہیں، حادثاتِ زمانہ کا مقابلہ کرتے ہیں، مصیبتیں جھیلتے ہیں، دُکھ بھوگتے ہیں مگر جُدا نہیں ہوتے۔ روزانہ کتنی شوخ اور چنچل چڑیاں ہمارے کلغی والے چڑے کے اردگرد منڈلاتی ہوں گی، مگر اسے اپنی چڑیا کے پہلو کے سوا

اور کہیں قرار نصیب نہیں۔ یہ حیوان ہے، ہم انسان ہیں۔ مگر ہم اتنے بےبس کیوں ہیں!"

زہرہ شاید چڑے چڑیا کی باتیں سُن کر متاثر ہو گئی تھی، آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی: "اگر انسان حیوانوں کی تقلید کر سکتے تو فرشتے بن جاتے۔"

چاند ڈوب گیا تھا۔ رات حیران سی رہ گئی تھی۔ شہر سے دُور بڑی سڑک پر کوئی شخص ٹارچ کو روشن کیے جا رہا تھا۔ زہرہ اُٹھی اور جاتے ہوئے بولی "اپنے کہے کا پاس رہے۔"

میں نے سمجھا اُس نے میرے کلیجے کو چٹکیوں سے نوچ لیا ہے، میرا جی اُلٹنے لگا۔ رشک و شبہ میں لپٹی ہوئی محبت کا انجام معلوم!

چڑے چڑیا کی سُنئے۔ ایک روز چڑیا صبح کو باہر نکلی تو گھبرائی ہوئی سی۔ آٹھ دس گز اُڑ کر فرش پر بیٹھ گئی، آنکھیں بیچ لیں، گردن جھکالی، لمحہ بھر بعد ہشیار ہو کر اُڑی، منڈیر پر جا بیٹھی، آنکھیں بند کر کے اونگھنے سی لگی۔ چڑا لمبے لمبے چکر کاٹ کر اُس کے پاس آتا اور چیختا ہوا اوپر فضا میں قلابازیاں سی کھاتا، پھر نیچے آجاتا۔ بہت دیر تک چڑیا کی یہی حالت رہی۔ کبھی فرش پہ ہے تو کبھی منڈیر پر، کبھی اونگھ رہی ہے تو کبھی پنجے گھسیٹ کر چل رہی ہے۔ میں اور آپا بے سُدھ بیٹھے دیکھتے رہے، ہمارے دل ہوا ہو گئے، آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ چڑیا ایک دو بار جھولی، لڑکھڑائی، ایک طرف لڑھک کر پنجے سمیٹے

اور پر ڈھیلے چھوڑ دیئے، چونچ کھولی اور وہ کھلی کی کھلی رہ گئی — چڑیا ختم ہو چکی تھی!

چڑیا بے چارہ اس قدر چیخا کہ امی تنگ آ گئیں۔ درست پناہ اُٹھا کر پھینکنا چاہا، تو میں نے کہا "امی! ذرا دیکھئے تو۔ آج بے چاری چڑیا مر گئی ہے — اسے چیخنے دیجئے۔ کل کلاں یہ بھی چل دے گا، دو اڑھائی سال اس کے ساتھ گزار کر اب اکیلے کیسے جئے گا یہ بدقسمت — بدنصیب!"

عابدہ تو ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

زہرہ ان دنوں بیمار تھی۔ میں اس خیال سے بے حد پریشان رہا کہ اُسے کیسے اطلاع دوں۔ خوش قسمتی سے اُس روز اُس کے ابا اسے ہمارے ہاں اٹھوا لائے کہ کھلا صحن ہے، تازہ ہوا کھائے گی بے چاری۔ وہاں اپنے گھر میں تو اُس کا دم گھٹا جاتا تھا۔ امی اور ابا جان کے لیے یہ بالکل معمولی بات تھی۔ وہ زہرہ کے لیے گھر کا گھر خالی کر سکتے تھے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ زہرہ ان کی بہو بنے گی۔ مجھے اُس روز اُوپر کے ایک کمرے میں رہنے کو کہہ دیا گیا۔

موقع پا کر ایک بار زہرہ کو دیکھا تو جیسے چاند گہن میں آ گیا ہے، وہ رنگ کیا ہوا، وہ بال کدھر گئے، وہ بھری بھری بانہوں کے خطوط اور وہ مرمریں گردن کا تناؤ! — الٰہی! کیا انسان کو اتنا خوبصورت بنا کر اتنا —

لیکن میں زہرہ کے حُسن کا پجاری نہ تھا۔ میں صرف زہرہ کا پجاری تھا اور وہی زہرہ میرے سامنے موجود تھی۔

شام کے قریب جب سب عورتیں اپنے کام کاج میں لگ گئیں تو میں زہرہ کے پاس آیا اور اُسے چڑیا کی موت کا قصہ سُنایا۔

اس کے بے رونق ہونٹ کھل گئے، بڑی بڑی ویران آنکھیں بھیگ گئیں۔ کروٹ بدل کر بولی "خدا خیر کرے!"

میں کچھ نہ سمجھا!

میں نے چڑیا کی قبر بنائی اور اُس پر سبز رنگ کا غلاف بھی چڑھا دیا۔

چڑا بے چارہ متواتر دو دن تک منڈیر پر بیٹھا اونگھتا رہا، نہ کھاتا تھا نہ پیتا تھا، سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ آپا عابدہ اور میں اُس کی حالت پر گھنٹوں افسوس کرتے اور جب کبھی زہرہ اُس کی طرف دیکھتی تو بے چین سی کروٹ بدل کر کہتی "خدا خیر کرے!"

تیسرے دن وہ منڈیر سے اُڑ کر شہتوت پر جا بیٹھا اور پھر گرتا پڑتا دوسری طرف اُڑ گیا۔ چار روز کے بعد ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کلغی والا چڑا منڈیر پر بیٹھا چوں چوں کر رہا ہے اور اُس کے پہلو میں ایک گوری چٹی بے آرام سی چڑیا پُھدکتی پھر رہی ہے!

زہرہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ عابدہ چہرے پر آنچل پھیلائے اندر بھاگ گئی۔

میں نے زہرہ کو اکیلا پا کر کہا: "زہرہ! کتنا بے وفا نکلا چڑا!"

بازو اٹھا کر آنکھوں پہ رکھتے ہوئے بولی: "خدا خبر کرے۔"

میں کچھ نہ سمجھا!

زہرہ کی حالت بہت نازک ہوتی جا رہی تھی۔ اُس کی رنگت خوفناک حد تک سفید پڑ گئی تھی۔ زندگی جیسے اُس کی حیران پتلیوں اور پژمردہ پپوٹوں میں سمٹ آئی تھی۔ اُس کے سیپی کے سے سفید ناخن، اِس کے اِکا دُکا نُچے کھچے بال، اُس کے مٹیالے دانت، پیشانی کی اُبھری ہوئی ہڈی، دھنسی ہوئی آنکھیں — جیسے جنگل کا پھول جو آندھیوں کے گرد وغبار سے اٹا پڑا ہو!

میرا جی دہل جاتا۔ میرے ذہن میں زہرہ کے وجود اور زہرہ کے حُسن میں کبھی نہ ختم ہونے والا مباحثہ شروع ہو جاتا۔ اور جب میں کسی نتیجے پہ نہ پہنچ سکتا تو گھبرا کر باہر گلیوں میں نکل جاتا اور اس تیزی سے چلتا کہ لوگ دانتوں سے اپنی انگلیاں کاٹ لیتے۔

ایک روز جب سب گھر والے اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے، زہرہ نے مجھے سوکھے ہوئے ہاتھ سے اپنی طرف بلایا اور جب میں اُس کے پنجر پہ جھک گیا تو وہ سرگوشی کرتی ہوئی بولی: "چڑے چڑیا کی مثال پیش کرتے ہوئے شاید انجام تمھاری نظروں میں نہ تھا۔ چڑیا چل بسی، چڑا دوسری چڑیا لے آیا۔ یہ پُرانا قانون ہے۔ کون کسی مرنے والے کے لئے اپنا جی ہلکان

کرتا پھرا۔ تم میری حالت دیکھ کر روتی ہو۔ میں تمھیں دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہوں۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ چڑے کی طرح وہ ایک بار منڈیر پر اُونگھے اور پھر۔۔۔"

میرے گلے میں گرہ سی پڑ گئی، اُٹھ کر باہر جانے لگا تو وہ بولی "کہاں چلے ہو پوری بات تو سُن لی ہوتی۔"

میں نے پلٹ کر پوچھا "کہو۔"

"کچھ نہیں۔" وہ بولی "تم سب سمجھتے ہو۔"

اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور میرے سر میں نکیلا کنکر سا بجنے لگا۔

دوسرے روز زہرہ کی حالت بے حد خطرناک ہو گئی۔ اُس کے والدین اُسے اپنے گھر لے گئے کہ وہ اپنے بزرگوں کی جگہ پر دم توڑے۔ مجھے اُس روز ابّا نے دو مہینوں کے لئے چچا جان کے ہاں لاہور بھیج دیا۔ کام کی نوعیت سوائے اس کے اور کوئی نہ تھی کہ چچا جان مجھے دیکھنا چاہتے تھے۔

لاہور پہنچا تو چچا جان کی بڑی لڑکی نجمہ ہر وقت میرے سامنے رہنے لگی۔ اس پر مستزاد یہ کہ میرے اور اس کے کمرے میں صرف ایک دروازہ حائل تھا، جس میں لکڑی تھوڑی تھی اور صاف شفاف شیشے زیادہ۔ دروازے پر پردہ لٹکانے کا تکلف بھی غیر ضروری سمجھا گیا۔

جب صوفے پر لیٹے لیٹے میری نظریں نجمہ کے کمرے میں پڑتیں تو وہ مجھے ٹک ٹک گھورتی رہی ہوتی۔ دو تین روز تو آنکھیں جھپکا کر ایک طرف مڑ جانے میں گزر گئے۔ مگر آخر کہاں تک!

نجمہ اور زہرہ کے ہیولے آپس میں ٹکرا گئے، دھوئیں کا ایک بونڈا سا اُٹھا اور میرے حواس پر چھا گیا۔ میں نے سوچا، زہرہ تو میرے چلے آنے کے دوسرے روز ہی دم توڑ چکی ہوگی، زندگی زندہ رہنے کے لئے ہے، وقت اچھا گزر گیا، اب کون محبت کی لاش اپنے کاندھوں پہ اٹھائے پھرے!

نجمہ کا جدید حسن زہرہ کے قدیم حُسن پہ چھا گیا اور اسی لئے ایک روز ہمارے کمروں کے درمیان سے دروازے کا پردہ بھی اُٹھ گیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہُوا کہ جُونہی زہرہ کے مرض نے طول پکڑا، ابا جان نے اِدھر بات کی اور چچا جان نے اُنھیں لکھا کہ جب تک نجمہ مجھے دیکھ نہ لے وہ نہیں مانتی — اور اب نجمہ نے مجھے دیکھ اور سمجھ لیا تھا!

میں واپس گھر آیا تو معلوم ہُوا کہ زہرہ میرے جانے کے بعد اچانک اچھی ہونے لگی اور اب بھلی چنگی ہے، گھر کے کام کاج اب وہی کرتی ہے کل پڑوس میں ہنس رہی تھی۔

میں لڑکھڑا گیا، پلنگ پہ گرا تو کانوں میں کوئی پھنکارنے لگا۔

"کلغی والے کو اپنی کلغی کا احساس تو ضرور ہوگا نا بد"

"بڑوں کے بڑھنے کا انتظار کون کرے!"

"اپنے کہے کا پاس رہے!"

اور جب صبح کو مجھے امی نے نہایت محبت سے یہ خوش خبری سنائی۔ کہ عنقریب نجمہ سے تمھاری شادی ہو جائے گی تو میں بے سوچے پکار اٹھا۔

"میں نجمہ سے شادی نہیں کروں گا، میرا بیاہ زہرہ سے ہوگا۔"

دوسرے کمرے میں والد صاحب بیٹھے تھے، بھاگے آئے اور پکارے

"کیا کہا؟"

میں نے آنکھیں فرش پر گاڑ کر کہا "میں زہرہ سے بیاہ کروں گا۔"

گھر بھر میں میری اس گستاخی کے چرچے ہونے لگے۔ میرے والدین خاموش اور حیرت زدہ ہو کر ایک اندھیرے کمرے میں بیٹھ رہے۔

میں شام کو اپنے مکان سے باہر اکیلا کھڑا تھا کہ ایک لڑکی میرے قریب آئی اور اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی "سنئیے گا۔"

میں اُس کے قریب آگیا۔

بولی "زہرہ کہہ رہی ہیں، تم اپنے ماں باپ کا دل بُرا نہ کرو اور نجمہ سے بیاہ کر لو اور مجھ سے نا اُمید ہو جاؤ، میں تم سے شادی کرنے پر کنوارے کو ترجیح دیتی ہوں۔"

وہ یہ کہہ کر چلی گئی۔ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں ایک سایہ سا فضا میں

تیرتا ہوا آیا اور میرے کانوں میں پھنکارنے لگا "یہ مایوس چڑیا ہاتھ پہ تھو لگا
لگا بیٹھی تو پہروں رونا پڑے گا!"
میں بے قابو ہو کر کوڑے کے ایک ڈھیر پہ گر گیا اور کلغی والا چڑا
اوپر منڈیر پہ بیٹھ کر چرچر چوں چوں مجھ پہ پھبتیاں کسنے لگا!

سونے کا ہار

برادری میں عمر بھر شرم کے مارے آنکھیں جھکائے رکھنا بہت بڑا عذاب ہے۔ احمد علی کو اس کا شدت سے احساس تھا اور اس لئے وہ دن رات اس فکر میں رہتا تھا کہ اپنی اکلوتی بیٹی کو شادی کے وقت ایک ایسا ہار جہیز میں دے کہ شریکوں کی آنکھیں چُندھیا جائیں اور ندامت سے گردنیں جھک جائیں۔ تین بیگھے زمین تھی اور اس کے بھی اکثر حصے رہن ملے تھے۔ ساری عمر کوڑی کوڑی جمع کرتا رہا، نو کپڑے اور چاندی کے زیور خرید دیے۔ اب اُسے سونے کے ہار کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ ہار پہ تقریباً اڑھائی تین سو روپے خرچ آتے تھے اور جب ہار کے متعلق سوچتے سوچتے اُس کی نظر اپنی خفیہ پوٹلی پہ جا پڑتی جس میں اب ایک پیسہ بھی باقی نہ تھا تو اُس کے چہرے پہ اس قدر پسینہ چھوٹ نکلتا کہ بیوی کو اُس کی صحت کی فکر پڑ جاتی۔

محلّے کی بیاہی ہوئی نوجوان لڑکیوں کے گلے میں سنہرے ہار دیکھ کر اُس کا دل بے اختیار اُچھل پڑتا۔ اُس کی بیٹی ان سب لڑکیوں سے خوبصورت اور سلیقہ شعار تھی۔ نیز وہ حسّاس بھی تھی۔ اگرچہ وہ حیا سے اکثر خاموش اور

گھٹی گھٹی سی رہتی تھی۔ تاہم احمد کو خیال آتا تھا کہ بیٹی کے دل میں یہ آرزو یقیناً موجود ہوگی کہ اُس کے سینے پر بھی سونے کا ایک بڑھیا ہار جگمگائے۔ بیوی سے مشورہ کیا۔ تو وہ بولی "یہ خیال میرے دل میں بھی موجود تھا، پر تم سے کہتے ہوئے ڈرتی تھی کہ اتنی رقم کہاں سے آئے گی۔ بہتر تو یہ ہے کہ زمین بیچ ڈالو۔ ہم اب بوڑھے ہو چکے ہیں، بہت سی گزار چکے، تھوڑی سی رہ گئی ہے، محنت مزدوری کر کے یہ بھی کاٹ لیں گے۔ بیٹی ابھی جوان ہے۔ اُس نے جی بھر کے دُنیا بھی نہیں دیکھی۔ اُس کے گلے میں ہار نہ ہوا تو یہ سمجھو عمر بھر اسے اپنی سہیلیوں میں نکو بن کر رہنا پڑے گا۔ پڑوس کی نئی دُلھن دیکھی ہے تم نے؟ مینڈک ایسی ناک اور چھاج ایسے کان، سیاہ رنگ جیسے توے کی کالکھ مل رکھی ہے اور پھر اُس کی چھاتی پر بھی سونے کا ایک گز بھر لمبا ہار چمک رہا ہے۔ ہار ضرور خریدنا ورنہ ناک کٹ جائے گی۔ اولاد کے لئے فاقے کاٹنا بھی عبادت ہے۔"

احمد علی گھر سے نکل کر باہر چلا گیا۔ دیر تک ایک چٹان پر بیٹھ کر سوچتا رہا کہ جس زمین پر میں نے چالیس برس ہل چلایا، جس کے سہارے میں اب تک زندہ ہوں اور جس کے دم سے گاؤں والوں میں تھوڑی بہت ساکھ قائم ہے، وہ کسی غیر کے ہاتھ میں دے دوں اور خود بھوکے کتے کی طرح الگ بیٹھ کر آنکھیں جھپکاتا رہوں! اپنے پاؤں پر آپ ہی کلہاڑی

مارنا اِسی کو تو کہتے ہیں۔ لیکن خاندانی عزّت بھی تو کوئی چیز ہے۔ ساٹھ سال کی عمر ہے، جانے کب یہاں سے چل دوں۔ بیٹا تو کوئی ہے نہیں کہ زمینیں سنبھالے۔ وارثوں کے کام آئیں گی، جو ابھی سے میری ذرا سی بیماری کو بھی مرض الموت سمجھنے لگتے ہیں۔ کیوں نہ اُس سے فائدہ اُٹھاؤں؟ ایک نقصان میں ہزار فائدے چھپے ہوئے ہوں تو نقصان کو نقصان کہنا بد دیانتی ہے۔ میں تو برباد ہو جاؤں گا، پر میری بیٹی تو سکھی رہے گی۔ اور اُس کے سکھ کے مقابلہ میں میرا دُکھ ہے ہی کیا چیز!

وہ وہاں سے اُٹھا۔ شام ہو گئی تھی۔ کالے کالے پربتوں کے پیچھے سے چاند آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا اور چوٹیوں پہ درختوں کے سائے جیسے آسمان سے مُعلّق ہو کر رہ گئے تھے۔

اُحمد علی گھر واپس چلا آیا۔ بیوی دیئے کی روشنی میں بیٹھی چرخہ کات رہی تھی۔ کہنے لگی "تم سوچ کیا رہے ہو۔ خیر تو ہے؟"

"مجھے تو ہار کی اُلجھن نے بیمار کر دیا ہے!"

"زمینیں بیچ ڈالو۔ سو بات کی ایک بات کہی تھی میں نے!"

"مگر اپنا پیٹ کیسے بھرے گا؟"

"اپنا پیٹ کاٹ کر ہی اولاد کا پیٹ بھرنا پڑتا ہے۔ جلدی جلدی کوئی خریدار ڈھونڈ نکالو۔ میں اپنی لاڈلی بیٹی کو بن ہار کے دیکھوں تو میری آنکھیں

پھوٹ جائیں۔ سہاگن کے سینے پہ ہار نہ چمکے تو مجھے تو اللہ قسم رونا آجاتا ہے!"

احمد علی بہت دیر تک چارپائی پہ آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ بیوی کے خراٹوں سے تنگ آکر لیٹ جاتا، تو اپنی بیٹی کے خواب میں کوئی بے معنی سا نغمہ گنگنانے سے پھر اُٹھ بیٹھتا۔ چارپائی سے اُتر کر چلنے پھرنے کو جی چاہا۔ باہر پھاوٹیں پڑ رہی تھیں اور اندر ٹہلنے کی جگہ نہ تھی۔ کسی وقت آنکھ لگی، مگر یہی دو چار لمحے، جیسے کسی نے دل میں سوئی چبھو دی کانپ کر سر اٹھایا۔ دروازے کی طرف دیکھا کہ شاید باہر پو پھوٹنے کے آثار ہوں۔ گھٹاٹوپ اندھیرا تھا۔ اُس کے سرہانے غلے کی بوریوں کے پاس ایک ٹڈی اپنا کرخت نغمہ الاپ رہی تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ نغمہ اُس کے دماغ میں تیز نشتر کی طرح تیرتا جا رہا ہے۔ اُس نے گھبرا کر بوریوں کے قریب زور سے تالی بجائی۔ ٹڈی خاموش ہو گئی اور وہ اپنے سوئے ہوئے بازو پہ دکھتا ہوا سر رکھ کر اسی بے نتیجہ سوچ میں غرق ہو گیا۔

انسانی دل دھڑکتا نہیں، ہر لمحے نئے ارادے تخلیق کرتا ہے۔ کئی ارادے پیدا ہوتے ہی رد کر دیئے جاتے ہیں اور کئی اتنے بڑے ہو جاتے ہیں۔ اتنے بڑے ہو جاتے ہیں کہ دل کی سی محدود چار دیواری میں نہیں سما سکتے! کسی نہ کسی طریقے سے باہر نکل پڑنے کے لئے بے تاب ہو جاتے ہیں اور

اگر یہ ارادے بھی آخر کار رد ہو جائیں، تو دل اس ساغر کی طرح بے رونق ہو جاتا ہے، جس میں سے شراب اُنڈیل لی گئی ہو۔ احمد علی کا یہ ارادہ اُگا، بڑھا، کونپلیں پھوٹیں، کونپلیں شاخوں میں تبدیل ہو گئیں، شاخیں پتوں کے بوجھ سے زمین پر جھک گئیں اور اُنھوں نے زمین میں اپنی جڑیں اتار کر مختلف درختوں کی صورتیں اختیار کر لیں۔ احمد علی کو اپنا ارادہ گاؤں کے پنگھٹ کے کنارے اُگے ہوئے بڑ کی طرح نظر آنے لگا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر بوریوں کو چھوا۔ "میری زمین کی دولت!" پھر اپنی بیٹی کی چارپائی کو چھوا: "میری زندگی کا واحد سہارا!"

اب وہ مزے سے سو رہا تھا۔

جب اُس کی آنکھ کھلی تو سورج نیزہ بھر اُبھر چکا تھا۔ اُس کی بیوی باہر دھوپ میں دودھ بلو کر مکھن نکال رہی تھی اور بیٹی چھاج میں غلہ پھٹک رہی تھی۔ پڑوس میں ڈگڈگی بجنے کی آواز آ رہی تھی۔

وہ چارپائی پر اُٹھ بیٹھا۔ ڈگڈگی والا اسی کے گھر آ رہا تھا۔ اور اُس کے پیچھے ایک بندریا جھومتی جھامتی آ رہی تھی۔

"تیرا گھر آباد، تیرے دشمن برباد، تیرے بچے کی خیر۔ اپنے پیر کے صدقے، بوڑھی بندریا کو کچھ کھلا دے۔ اے مائی! اپنے بچے کا نام بتا، بندریا تیرے بچے کی شادی پر ناچنا چاہتی ہے!"

احمد علی کی بیوی بولی "میرا لڑکا کوئی نہیں بابا!"

"تیری لڑکی جب، تو اپنی آنکھوں سے اُس کو سہاگن دیکھے، تو اپنے ہاتھوں سے اس کے گلے میں سونے کا ہار ڈالے!"

چھاج پھٹکنے کی آواز بند ہو گئی۔ مکھن نکلنے کی آواز بند ہو گئی، احمد علی کے دل کے دھڑکنے کی آواز بند ہو گئی!

ڈگڈگی والا سوچنے لگا کہ اُس کے منہ سے کونسا ایسا نازیبا کلمہ نکلا کہ گھر کا گھر دم بخود ہو کر رہ گیا! بندریا کے دُم کے بال بھی کھڑے ہو گئے!

دُنیا کے بڑے بڑے واقعات اور ان ذرا ذرا سے حادثات میں آخر فرق ہی کیا ہے۔ یہ ننھا سا واقعہ احمد علی اور اُس کی بیوی کے لیے کتنا عظیم الشان واقعہ تھا ـــ زندگی کی ساری تمناؤں کی معراج! ـــ واقعات کی عظمت دلوں کی دھڑکن سے پہچانی جاتی ہے۔ جب نپولین ایلپس کی برفانی چوٹیوں کو روندتا ہوا اُن کی دشوار گزاری پر مسکراتا ہوا آگے بڑھا جا رہا تھا تو کیا اُس کے دل کی دھڑکن احمد علی کے دل کی دھڑکن سے زیادہ تیز ہو گی؟

احمد علی نے اپنی پگڑی اُتار کر ڈگڈگی والے کو دے دی۔

من کی بات بوجھ کر دُعا دینے والے فقیروں کو انسان جو بھی دے کم ہے۔

۲

احمد علی نے ایک میلا سا پٹکا سر کے گرد لپیٹا اور باہر جانے لگا۔ بیوی نے اسے چھاچھ پینے کو کہا اور بولی "آج تو خوب سوئے!"

شاید اُس نے شوہر کے بستر کی شکنیں نہیں دیکھی تھیں۔ احمد علی نے کہا۔ "جانے آج کیوں ایسی گہری نیند آئی۔ چھاچھ جلدی لے آ۔ مجھے بڑے ضروری کام پر جانا ہے!"

"بڑا ضروری کام!"

اُس کی بیوی کا ہاتھ کانپ گیا۔ وہ جانتی تھی کہ بڑا ضروری کام کونسا ہے! آپ سے آپ اس کی نظر اپنی بیٹی کے سینے پر جا پڑی، جو موٹی سی نیلی چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس نیلے پردے کو چیر کر اس کی نگاہیں ایک سنہرا ہار دیکھنے لگیں، جس کے وسطی حصے میں سرخ رنگ کا ایک نگینہ مسکرا رہا تھا۔ پڑوس کی نئی دلھن کے ہار کی طرح!

•

احمد علی چھاچھ پی کر ذیلدار کے گھر گیا۔ وہ ڈیوڑھی کے باہر دھوپ میں بیٹھا پیچوان کے کش لگا رہا تھا۔ احمد علی کو اتنا سویرے آتا دیکھ کر بولا "کیا بات ہے احمد علی! خیر تو ہے نا؟ آج صبح صبح کیسے آنا ہوا؟ بھتیجی کا کام کب شروع کرو گے؟ کوئی میرے لائق خدمت ہے؟"

احمد علی ایک مختصر سے سوال کے مختصر سے جواب کا خواہش مند تھا۔ بولا

"ملک جی! مجھے اپنی زمین بیچنے کی ضرورت پڑ گئی ہے، اگر آپ اس وقت یک مشت رقم ادا کر دیں تو میں انتقال آپ کے نام چڑھا دوں۔"

ذیلدار نے جواب دیا۔ "نقد رقم میرے پاس موجود نہیں۔ دونوں لڑکوں نے چھ ماہ سے پھوٹی کوڑی تک نہیں بھیجی۔ غلّہ اب کے بکا نہیں، بہت سستا تھا۔ گرانی کا انتظار تھا، مگر پچھلے دنوں بارش ہو گئی۔ میں ماہ دو ماہ کے بعد رقم دے سکوں گا۔"

احمد علی مایوس ہو کر بولا۔ "مہینے دو مہینے کون انتظار کرے۔ ملک جی! آپ کی بھتیجی کا کام تو بس آٹھ دس دن کے بعد ہونے والا ہے۔ لڑکے والے تنگ کر رہے ہیں۔ اس کی چھٹی ختم ہونے والی ہے اور اُدھر سرحد پر لڑائی شروع ہے۔ اُسے پھر چھٹی نہ ملے گی۔ اگر آپ نہ خرید سکیں تو میں چودھری نبی بخش سے بات کروں؟"

"میرے دُشمن سے!"

"مگر مجبوری ہے نا ملک جی!"

"یعنی تمھیں میری پروا نہیں!"

ذیلدار نے غصّے میں آ کر اس زور سے حقّے کا کش لگایا کہ دو چار کوئلے چلم میں سے اُچھل کر فرش پر جا گرے۔

گاؤں کے سردار سے دُشمنی مول لینا بہت مہنگا سودا تھا لیکن بیٹی

کی شادی کو معرضِ التواء میں ڈالنا بھی احمد علی کے خیال میں اچھی بات نہ تھی۔ سوچنے لگا۔ مُفت میں برادری میں سُبکی ہو گی کہ جیب خالی تھی، گھبرا گیا۔
اُسے معلوم تھا کہ ذیلدار اپنے مخالفین کو بیگار میں پکڑ کر تھانے دار کے کام پر بھیج دیتا ہے، پولیس والوں کے آنے پر اُن کے گھر سے مُرغیاں مُفت پکڑوا لیتا ہے، ان پر سرکاری ذخیرے سے لکڑیاں کاٹ کر لانے کا الزام دھر کر بیس بیس روپے جرمانہ کرا دیتا ہے، بات کو چوکیدار کے ہاتھ میں دے کر اُس کی فصل کٹوا سکتا ہے! لیکن سونے کے ہار کی جگمگاہٹ اس کے ان خیالات پر چھا گئی۔ اور وہ چودھری نبی بخش کے مکان کی طرف اس تیزی سے چلنے لگا کہ گلی میں اس کے پیچھے بہت دیر تک غبار کی ایک لکیر سی نظر آتی رہی۔
چودھری نے زمین کی آدھی قیمت بتائی۔
احمد علی نے اس پر اعتراض کیا تو وہ بولا " تو پھر کہیں اور بیچ ڈالو، میری طرف سے تمھیں آزادی ہے، ذیلدار کے ہاں بیچ دو۔"
" نقد روپیہ اور کون دے گا؟"
احمد علی جیسے اپنے دل سے مشورہ کر رہا تھا۔
" ہاں ہاں۔ میری طرف سے تمھیں کوئی رکاوٹ نہیں، میں نے اپنا فیصلہ بتا دیا۔ منظور ہو تو نقد لو۔ اور رسید لکھ دو۔"

اُس نے ایک طرف ہاتھ بڑھایا، تکیئے کے نیچے سے ایک تھیلی چھن چھن کرتی احمد علی کے سامنے آگری۔

احمد علی کی نبض رقص کرنے لگی، سونے کا ہار فضا میں جھولتا ہوا کہیں غائب ہو گیا۔

اُس نے چودھری کی لکھی ہوئی رسید پر انگوٹھا لگا کر ڈھائی سو روپے لے لیے اور گھر کا رُخ کیا۔ زمین بک جانے کے خیال سے اُس کے دل میں ایک شعلہ سا بھڑک اُٹھتا تھا اور پگڑی میں بندھے ہوئے ڈھائی سو روپے کو چھو کر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی تھی۔ خیالات کے مدوجزر سے اُس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ راستے میں سوچا کہ اب ہار لے کر گھر جاؤں تو لطف آئے۔ ایک بار تو بیوی کا دل دھک سے رہ جائے گا۔ بے چاری خوشی سے مر نہ جائے!

تین میل دُور ایک قصبے کے بڑے سُنار کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے چاندی کے تمام زیور اُسی سے خریدے تھے۔ سُنار اُسے بڑے تپاک سے ملا۔ ہاتھ ٹیک کر تعظیماً اٹھا۔ اور پھر اڈے پر بیٹھ گیا۔ اپنی سانسوں کو جو اُٹھنے کی کوشش میں گتھم گتھا ہو گئی تھیں، اپنی اصلی حالت میں لانے کی سعی کرتے ہوئے بولا "اِدھر میرے پاس تشریف رکھیئے۔ سنایئے کیسے آنا ہوا! آپ تو ہمارے پرانے گاہک ہیں اور پرانے گاہکوں سے ہم عام دکاندار

سابر تاؤ نہیں کرتے۔ پرماتما کی قسم! آپ تو میرے بھائی ہیں!"

احمد علی نے شکریہ ادا کر کے ہاروں کی فرمائش کی۔ اب کے سُنار اس تیزی سے اُٹھا، جیسے ربڑ کا ہلکا پھلکا غبارہ پھونک مارنے سے ہوا میں اُڑنے لگے۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا لوہے کی ایک الماری تک گیا۔ ایک زرنگار صندوقچہ نکالا اور جھاڑ پونچھ کر احمد علی کے قدموں میں رکھ دیا۔" یہ سب آپ کا مال ہے!"

احمد علی کے نتھنے پھڑکنے لگے، سانسیں تیز ہوگئیں، آنکھیں چمک اُٹھیں، ہاتھوں میں رعشہ آگیا۔ صندوقچہ کھولا تو آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ اُس نے ایک لمبا سا خوبصورت ہار چن لیا جس کے وسطی حصّے میں سُرخ رنگ کا ایک نگینہ مسکرا رہا تھا۔ پڑوس کی نئی دُلھن کے ہار کی طرح!

"اِس کی قیمت؟"

سُنار نے پھونکنی کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے کہا" آپ سے ایک بات کروں گا۔ ڈھائی سو روپیہ!"

"لیکن......"

"میں نے لیکن ویکن کی تو گنجائش ہی نہیں رکھی ملک احمد علی! اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اُس سے پورے پانسو بٹورتا۔ لیکن آپ میرے پُرانے گاہک ٹھہرے میرے بھائی! لاگت کے دام بتائے ہیں۔ یہی

سمجھوں گا کہ باقی رقم اپنی بھتیجی کو شادی کی خوشی میں پیش کر دی۔"
احمد علی کی جیب نے ڈھائی سو روپیہ اُگل دیا۔

۳

شادی کے دن جب جہیز صحن میں بچھا یا گیا تو احمد علی ایک چنگیز میں سونے چاندی کے زیور سجا کر لے آیا۔ اور انھیں پلنگ پر رکھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ عورتیں اس چمکتے دمکتے ہار کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہو گئیں اور ایک دوسرے کے ہاروں کو چھو چھو کر کہنے لگیں "اری اس سے بڑھیا ہے۔ دیکھ تو سہی جیسے پلنگ پر آگ جل رہی ہے۔"

فضا سرگوشیوں کی سرسراہٹ سے معمور ہو گئی — "سونے کا ہار! سونے کا ہار۔ آدھ پاؤ سونے کا ہار! — احمد علی نے اپنے خاندان کی لاج رکھ لی۔"

ناگاہ بوڑھوں کے مجمعے سے ذیلدار نکلا۔ اور احمد علی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا "مبارک ہو احمد علی! خدا کرے میری بھتیجی سکھ چین سے سہاگ کی زندگی بسر کرے۔"

اُس نے بڑھ کر ہار اٹھا لیا۔ تمام مجمع دم بخود کھڑا تھا۔ سب کے لبوں پہ تعجب انگیز مسکراہٹ تھی۔ احمد علی کی حیثیت ایسے گراں بہا ہار سے

بہت کم تھی۔ یہ اُس کی محبت پدری کا ایک معجزہ تھا۔

ذیلدار ہار کو اپنی آنکھوں کے بہت قریب لے گیا، اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اور بھرے مجمع میں بلند آواز سے بولا "احمد علی! یہ تو نقلی سونا ہے!"

مجمع پر مُردنی سی چھا گئی۔ ذیلدار کچھ وقفے کے بعد بولا "یہ تو نقلی سونا ہے۔ دس پندرہ رُپے کا ہوگا یہ ہار۔ چمک دَمک تو بہت زبردست ہے اس کی!"

احمد علی نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا "میں نے تو یہ ہار ڈھائی سو روپے میں خریدا ہے۔"

ذیلدار بولا "خریدا ہوگا۔ مگر اصل میں یہ ہے پندرہ رُپے کا۔ تانبے پر سونے کا ملمع چڑھا ہوا ہے۔ امیر چند سُنار! اِدھر آنا ذرا، یہ ہار دیکھنا۔"

احمد علی کی قسمت کا فیصلہ امیر چند کی زبان کی ایک ذرا سی حرکت پر منحصر تھا۔ امیر چند نے عینک لگا کر ہار کو بغور دیکھا اور اسے چنگیر میں رکھتے ہوئے بولا "نقلی ہے۔"

ہر طرف چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ عورتیں ناک پر اُنگلی رکھ کر احمد علی کا تمسخر اُڑانے لگیں!

احمد علی پلنگ کے رنگین پائے کا سہارا لئے بُت کی طرح کھڑا رہا،

وہ اپنی آنکھیں تک جھپکانا بھول گیا۔

دُلھن ڈولی میں سوار ہونے کو تھی کہ اُس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ دھڑام سے زمین پر آ رہی۔

ڈیلدار سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہوا اپنے حواریوں کے ساتھ ایک گلی میں مُسکراتا جا رہا تھا۔

غریب کا تحفہ

میں نے اُسے گاؤں سے باہر ایک کھنڈر کی جھکی ہوئی دیوار پر اُپلے
تھوپتے دیکھا۔ اُس نے مجھے ایک بار اُچٹتی سی نظر سے دیکھا اور اپنے
کام میں مصروف ہو گئی۔ میں نے بھی اُس پر یونہی ایک اڑتی سی نگاہ ڈالی
اور آگے نکل گیا۔ اُپلے تھوپنا کوئی ایسا تعجب انگیز کام نہ تھا کہ میں
ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا اور اُسے گھورنے لگتا۔ گاؤں کی ہر عورت صبح
اُٹھ کر نماز سے پہلے یہی کام کرتی ہے۔ میں وہاں سے سیدھا گھر آ گیا۔
دوسرے روز میں مُنہ اندھیرے ہی گھر سے نکلا کیونکہ اس روز مجھے
ایک بہت بلند چوٹی پر طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھنے جانا تھا۔ میں گاؤں
سے باہر نکلا تو ایک سایہ سا سر پہ ٹوکری اٹھائے میرے آگے آگے
رینگتا نظر آیا۔ میں نے یونہی پوچھ لیا "کون ہے بھائی؟"۔
"جی میں ہوں۔" یہ ایک عورت کی آواز تھی۔ میں خاموش ہو رہا۔
طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھ کر میں اسی راستے سے واپس ہوا تو اسی
دیوار پر اُپلے تھوپے جا رہے تھے۔ اُس نے مجھے ایک بار دیکھا اور
اُس کے دیکھنے میں کوئی ایسی خاص بات نہ تھی کہ میں رُک جاتا۔ میں چلا گیا

اور وہ سر جھکائے تھپا تھپ اپنے ہاتھوں کو تیزی سے جُنبش دیتی رہی۔

اور یہ منظر میں نے صرف دو دن ہی نہ دیکھا۔ متواتر دس روز مُجھے یہی لڑکی اسی کھنڈر کے پاس اپنے کام میں مصروف نظر آتی رہی۔ دسویں روز میرے دل میں خیال آیا کہ آخر یہ لڑکی اپنے گھر اُپلے کیوں نہیں تھوپتی۔ یہاں بھیانک کھنڈر کی کمزور دیوار سے اُسے کیا لگاؤ ہے؟ — لیکن ان دنوں میں اپنی شادی کی تیاریوں میں کچھ اس شدّت سے مصروف تھا کہ کسی ایک خیال کا مسلسل طور پر میرے دماغ پر مسلّط رہنا دشوار تھا — میں سیدھا اپنے گھر آ گیا۔

دوسرے روز میں علی الصبح اُٹھ کر گاؤں سے باہر گیا تو وہ رستے میں بیٹھی گوبر اکٹھا کر رہی تھی۔ رستہ ذرا تنگ تھا، میں اُس کے قریب آ کر رُک گیا۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور تیزی سے ایک طرف ہو کر بولی "گزر جائیے جی۔"

میں نے ایک قدم اُٹھایا مگر مُڑ کر صرف اتنا پوچھ لیا "تم کس کی بیٹی ہو؟"

اُس نے پھٹی ہوئی چادر سینے پر پھیلا کر کہا "میں پردیسی ہوں جی میرے ماں باپ مر گئے ہیں۔"

میں نے پھر پوچھا "کس کے اُپلے تھوپتی ہو؟"

بولی "اپلے جی! انھیں بیچ کر پیٹ بھرتی ہوں۔"
میں آگے نکل گیا۔ ایک بار مڑ کر دیکھا تو وہ ایک اور جگہ بیٹھی ٹوکری میں گوبر ڈال رہی تھی۔ میری کنپٹیوں کی رگیں قدرے پھول کر دکھنے لگیں اور دماغ کی نسوں میں ایک کھچاؤ سا پیدا ہو گیا۔ میں راہ کے ہموار ہونے کے باوجود ٹھوکریں کھانے اور ہانپنے لگا! — واپسی پر میں نے اسے اُسی دیوار کے پاس جھکتے اُٹھتے اور پلٹتے دیکھا اور اگلے روز وہ مجھے پھر اُسی راستے پر ملی۔ میں اُس کے قریب آ کر رُک گیا۔ اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور بولی "آپ ہیں جی؟"
"ہاں۔" میں بولا۔
"بہت سویرے نکلتی ہوں گاؤں سے!" — وہ نظریں جھکائے ہوئے ایک طرف ہو کر کہنے لگی "سویرے نہ نکلوں تو دوسری لڑکیاں راہیں صاف کر جائیں اور میرا تو یہی روزگار ہے جی!"
میں وہیں رُک سا گیا۔ وہ ٹوکری اُٹھا کر آگے جانا چاہتی تھی۔ مجھے چُپ چاپ کھڑا دیکھ کر بولی "آپ صبح سویرے کہاں جاتے ہیں جی؟"
"سُورج کے طلوع ہونے کا منظر دیکھنے۔" میں نے کہا۔
"اچھا جی!" اس نے یہ الفاظ یوں کہے گویا وہ میرا مطلب نہیں سمجھی۔
چار دنوں کے لئے مجھے گاؤں سے باہر جانا پڑا۔

پانچویں روز میں واپس آیا تو صبح سویرے اُٹھ کر اِدھر چل دیا۔ وہ بھینسوں کے ایک گلے کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی۔ اچانک وہ گوبر اُٹھانے کے لیے جھک گئی۔ میں اُس کے قریب پہنچا تو اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور اُس کے لبوں پر اُداس سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ بولی "آپ کہاں چلے گئے تھے جی؟"

"پردیس میں کچھ کام تھا،" میں نے کہا۔

وہ لکڑی کو سر پر جما کر بولی "میں چار دن آپ کی راہ دیکھتی رہی۔ میں نے کہا، اللہ خیر کرے ملک جی کیوں نہیں آئے! میں تو آج آپ کے گھر جانے والی تھی۔"

میرا دل دھڑک کر بجلی کی لہریں سی چھوڑنے لگا۔ جسم سُن ہو کر رہ گیا۔ اور کانوں میں ایک مسلسل سی گونج پیدا ہو گئی۔

بادلوں کے دو چار گوالے گول ٹکڑے مشرقی پربت پر منڈلا رہے تھے۔ اُبھرتے ہوئے سورج کی لرزتی ہوئی کرنوں سے اُن پر لمحہ بہ لمحہ گلابیاں دوڑی جا رہی تھیں اور اُن کے عکس خاموش وادی پر ارغوانی پردے سے پھیلا رہے تھے۔ گیہوں کے تازہ اُگے ہوئے پودے اوس کے بوجھ سے زمین پر جھکے جا رہے تھے اور دور بھینسیں چرانے والا گاموں، بہنوال دردناک سُروں میں ایک گیت الاپ رہا تھا:

گجدیاں وجدیاں ہاٹھاں چڑھیاں
کن کن کنیاں ٌدسیاں

اس وقت میں نے لڑکی کو کچھ اس طرح دیکھا کہ وہ کانپ کر لجا گئی۔ اس کا رنگ پربت کی چوٹی پر منڈلاتے ہوئے بادلوں کا سا ہو گیا۔ اس کی گہری کالی آنکھوں پر پھیلی ہوئی نمی کی ہلکی سی تہ بھی گلابی ہو گئی۔ اس نے جھک کر ٹوکری اٹھائی اور آگے جانے لگی۔ مہینوال بہت دور جا چکا تھا اور گاؤں کے آس پاس کوئی شخص نظر نہ آتا تھا۔ لڑکی کا کھلی آستینوں والا میلا چولا نرم نرم جھونکوں سے آہستہ آہستہ لہرا رہا تھا اور جس بازو سے اس نے ٹوکری تھام رکھی تھی وہ شانے تک عریاں تھا ــــ میں بے ارادہ اس کی طرف تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ ایک گنجان جھاڑی کے پاس میں نے اسے جا لیا۔

اس کی آنکھوں میں خوف تھا اور ہونٹوں میں کپکپی۔ اس کے پریشان بال اس کے گالوں اور کانوں کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہے۔ وہ قریب ہی گول گول پتھروں کی دیوار سے چمٹ گئی اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولی "آپ! ملک جی آپ کیا چاہتے ہیں؟" ــــ اس نے ٹوکری دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے جکڑ لی۔ اس کا دوسرا بازو بھی عریاں ہو گیا۔ میلی چادر سینے سے ڈھلک کر اُس

طرف لٹکنے لگی اور اُس کی سانسیں بہت تیز ہو گئیں۔

میں گھبرا گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اُسے کیا کہوں ۔۔۔ میں اُسے کچھ کہنا ضرور چاہتا تھا، مگر میری زبان کوئی لفظ نہ ڈھال سکی، حلق میں پھندا پڑ گیا اور جھجک کر بولا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"خانی" اُس نے یہ لفظ یوں کہا جیسے اُس نے ایک بہت بھاری مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے!

میں واپس ہو پڑا۔ میں وہاں ٹھہر نہ سکا۔ میری نبضوں سے آنچ اُٹھنے لگی اور کان گو بجنے لگے۔ میں گاؤں میں داخل ہوا تو نوجوان مستری "دینو" ملا۔ بولا "السلام علیکم ملک جی! خیریت تو ہے؟ آپ کا چہرہ زرد ہو رہا ہے۔"

"خیریت ہے بھائی!" ۔۔۔ اور میں تیزی سے آگے نکل گیا۔ نوجوان زور سے کھانسا ۔۔۔ کھانسی مصنوعی تھی! ۔۔۔ میرے دل میں جیسے کسی نے چٹکی لی۔

دن بھر میں چوپال پر نہ گیا۔ نمبردار نے دو تین میراثیوں کے ذریعے کہلا بھیجا کہ وہ لاہور سے نئے نئے ریکارڈ خرید لایا ہے اور تمام گاؤں صرف میرے انتظار میں چوپال پر اکٹھا ہے، لیکن میں نے کوئی بہانہ کر کے اُنھیں ٹال دیا۔ اباجی آئے، پوچھنے لگے "آج پڑھا کچھ نہیں؟" میں نے کہا "جی

سر میں درد ہے ۔" آن کی آن میں انگریزی اور یونانی ادویات کا انبار میرے سامنے تھا ۔ اُف والدین کی انجان محبت !

شام کو میں چھت پر ٹہلنے کے لئے کمرے سے نکلا ۔ دیواروں پر اُپلوں کی قطاریں پڑی تھیں ۔ بے ارادہ میری زبان سے یہ الفاظ نکل گئے "امی ! یہ اُپلے کس نے تھوپے ؟"

" بیگماں نے اور کس نے !"

" اچھا ! بیگماں نے ! — میں سمجھا کہیں سے خریدے ہیں !

امی آنکھیں جھپکانے لگیں ۔ بولیں " سر تو نہیں گھوم رہا تیرا ؟ — اندر لیٹ جا کمرے میں ۔ ہوا لگ جائے گی ۔"

لیکن میں شام کے اندھیرے میں گھر سے نکلا اور اُسی کھنڈر کی طرف چل دیا ۔ اُپلوں پر اُپلوں والی کی اُنگلیوں کے نشان تھے جن پر میں اپنی اُنگلیاں پھیرتا رہا ۔ سامنے اندھیرے میں مجھے میرے شہری دوست ہنستے نظر آئے اور پھر اسی اندھیرے سے ایک لڑکی سر پہ ٹوکری اُٹھائے اُبھری اور اسی اندھیرے میں گھل گئی ۔

گاؤں میں گھر گھر دیئے ٹمٹما اُٹھے ۔ میراثیوں کے گھر سے شہنائیوں کی آواز بلند ہوئی ۔ کوئی نوخیز لڑکا شہنائی سیکھ رہا تھا ! کھنڈر کی دیواریں تاریکی میں مل گئیں ۔ اندھیرا اس قدر گہرا ہو گیا کہ مجھے اپنا وجود تک نظر نہ آتا تھا ۔ میں نے

اُوپر دیکھا۔ آسمان پر بھیانک بادل گھِر آئے تھے!

میں چُپ چاپ سر جھکائے گھر کی طرف چل پڑا۔ میرے قدموں کی چاپ سے جھینگر بھی خاموش ہو گئے اور ہوا بھی جیسے ساکن ہو گئی۔ پگڈنڈی سے دُور ایک کمہار کے گھر سے کتا میری طرف جھپٹا اور میرا پتھر کھا کر ٹیاؤں ٹیاؤں چیختا لوٹ گیا۔

دُور کہیں بادل گرجے —— دُور کہیں بجلی چمکی اور کھیتوں کی پرلی طرف سے کوئل کی آواز آنے لگی۔ ہوا سرسرانے لگی اور خوابیدہ جھاڑیاں اپنے پتے کھڑکھڑانے لگیں۔ پھوئیوں پھوئیوں مینہ برسنے لگا۔ میں گھر کی طرف دوڑنے لگا۔

اچانک میرے قدم آپ سے آپ رُک گئے۔ اور پھر میں پلٹ کر کھنڈر کی جانب دوڑا۔ میں نے سوچا، غریب لڑکی کی ہفتوں اور مہینوں کی محنت خاک میں مل جائے گی، اُپلے بھیگ جائیں گے اور بیچاری فاقے کھینچے گی! جتنے اُپلے میں اندھیرے میں اکٹھے کر سکا، کھنڈر کی بوسیدہ چھت کے نیچے رکھتا گیا۔ اسی اثنا میں مینہ چھاجوں پڑنے لگا۔ بجلی کی چمک، بادل کی کڑک اور ہواؤں کی چیخوں سے اندھیرے میں ہنگامہ سا بپا ہو گیا۔ لیکن میں خوش تھا۔ غم و اندوہ کی دُھند چھٹ گئی۔ میں ٹھنڈی ہوا اور تیز پھوار کے سیلاب میں کود گیا اور نہایت تیزی سے گاؤں کی طرف

بھاگنے لگا۔

اچانک مجھ سے کوئی چیز ٹکرائی اور ساتھ ہی ایک ہلکی سی چیخ سُنائی دی۔ میں کیچڑ میں سے اُٹھتے ہُوئے اِدھر اُدھر ہاتھ پھیرنے لگا کہ کہیں گرنے والا بے ہوش تو نہیں ہو گیا۔ پہلے تو میرے ہاتھ بہتے ہوئے پانی میں تیرتے رہے؛ پھر اُن سے لمبے لمبے بال مس ہوئے — اور پھر ایک بھیگے ہوئے سڈول بازو پر — میرا ہاتھ ایک جھٹکے سے پرے ہٹا دیا گیا۔ اور خوفزدہ آواز آئی۔ "تم کون ہو؟"

یہ اُپلوں والی کی آواز تھی۔ میرا دماغ قلابازی سی کھا گیا۔

میں بولا "اندھیر انھا خانی! — اور پھر میں کوئی غیر تو ہوں نہیں!"

تیز تیز سانسوں اور ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکوں کی سرسراہٹوں میں کمہار کے کتے کی آواز گونجی جو شاید بادلوں پر بھونک رہا تھا! — تمانی خاموش تھی۔

اچانک بادل زور سے گرجا اور بجلی اس شدّت سے چمکی کہ کھُلے بالوں اور بھیگے لباس والی حیران حسینہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میں دو قدم آگے بڑھ گیا

میں نے پُوچھا "اس طوفان میں کدھر بھاگی جا رہی تھیں؟"

"جی! کھنڈر کی طرف۔" اس کی آواز بھرّائی ہوئی تھی۔ "جی میں نے

ان تین ہفتوں میں جتنے اُپلے تھوپے وہ کوئی تین مہینوں میں تیار کر سکے
نوجوانوں۔ مجھ غریب کی یہی دولت تھی جی! سب اُپلے بھیگ گئے ہوں گے
اور میں ایک ہفتہ فاقے کاٹوں گی۔ اب ایک ہفتہ تک ——" وہ آگے
نہ بول سکی۔ اس کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔ میں اندھوں کی طرح
اِدھر اُدھر ہاتھ ہلاتا آگے بڑھا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوا۔ اس نے کوئی
جُنبش نہ کی۔ میں نے اس کا ہاتھ بالکل شہری نوجوانوں کی طرح دبایا۔ اور
بولا "میں کھنڈر کی چھت تلے تمہارے سب اُپلوں کا ڈھیر لگا آیا ہوں
—— بے فکر رہو۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ کانپ گئی ہے "آپ کتنے اچھے ہیں جی!"
"میں بہت بُرا ہوں خانی!" میں مدت کی ان کہی بات کہنا چاہتا
تھا" میں نے تمہیں گرا دیا۔ اب جانے تمہیں کہاں کہاں چوٹیں آئی
ہوں گی!"

"میرے کوئی چوٹ نہیں آئی! —— آپ ——"

وہ رُک گئی۔ بارش تھم چکی تھی، رات پہاڑی نالوں کی آواز سے
گونج رہی تھی۔ اور بجلی کی چمک اُفق کی طرف سرک گئی تھی۔ خانی نے اپنا
ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا "اب میں گھر جاؤں جی؟"

"گھر؟" میں نے پوچھا "تمہارا ابھی کوئی گھر ہے خانی؟"

بولی "جی ایک خدا ترس نے ایک کٹیا دے رکھی ہے۔ اب جا کر وہاں سے پانی نکالوں گی جو چھت سے ٹپکا ہو گا۔ پھر سر چھپانے کا سہارا تو ہے جی!"

میرا آراستہ پیراستہ کمرہ اچانک میرے ذہن پہ اُبھرا، لرزا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اندھیروں میں جذب ہو گیا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ میں نے سوچا ہم زندگی کے اس قدر مختلف زاویوں پہ کیوں رکھے گئے ہیں ـــ یہ کیسا قانون ہے ـــ یہ کیسی مصلحت ہے۔

میں نے کہا "خانی! آخر تم مجھے یہ کیوں نہیں بتاتیں کہ تم کہاں کی رہنے والی ہو؟ یہاں کیسے آئیں؟ تم گوبر چننے کے لائق نہیں تھیں خانی! ـــ تم تو ریشم و کمخاب میں لپٹی رہنے کے قابل ہو!"

"آپ ـــ" اُس کی آواز کانپ گئی "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟ ـــ آپ سُن کر کیا کریں گے؟"

"خانی!" میں نے احساسات کے طوفان میں دب کر سرگوشیانہ انداز میں کہا "خانی۔"

میں نے پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اُس کی اُنگلیاں بھیگی ہوئی تھیں ـــ مگر بارش کا پانی گرم تو نہیں ہوا کرتا!

میں نے کہا "خانی! تم اب غریب نہ رہو گی ـــ میرے ہوتے

نھیں۔ ”

اُس نے میری بات کاٹ لی۔ ”آپ جی بلے۔ ایسی نہ کیا کریں۔ میں ایسی کئی باتیں سُن چکی ہوں اور اب اُنھیں بُھلا بھی چکی ہوں؟ میرے ماں باپ نے مجھے جس خوبصورت نوجوان سے بیاہا، وہ بھی اسی قسم کی باتیں کرتا تھا۔ پھر جب ایک وبا میں میرے ماں باپ اور بھائی مر گئے تو اُس نے ایک اور لڑکی سے شادی کر لی اور مجھے گھر سے نکال دیا۔ اب یہ باتیں مجھ پر اثر نہیں کرتیں ـــ ریشم اور کمخاب پر سونے کی لذت بھی چکھ چکی ہوں اور کُھسے پھٹے چیتھڑوں کی بھی! ـــ اَب اُپلے تھوپنے میں ہی مزا ہے۔ اب نہ ریشم و پشم کی ہوس نہیں رہی جی! آپ نے میرے اُپلے محفوظ کر دیئے۔ اس کے لئے میرے پاس شکریے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو میں دینے کی جرأت نہیں کر سکتی۔“

وہ رُک گئی۔ اندھیرے میں کسی نے مجھے پکارا۔ میں نے آہستہ سے کہا ”خانی! تم مجھے ایسا نہ سمجھو۔ میں اُن لوگوں میں سے ـــ“ ایک اور آواز آئی۔ میں نے کہا ”کوئی مجھے ڈھونڈ رہا ہے۔ کل ملو گی ـــ کھنڈر کے پاس؟ ـــ کل صبح ـــ یا شام کو ـــ ملو گی نا؟“ ـــ اور کوئی جواب نہ پا کر میں نے کہا ”اچھا“ ـــ میں اُس کا ہاتھ تیزی سے اپنے لبوں تک لے گیا۔ اس نے چیخ کر اُسے پیچھے کھینچ لیا۔ میں گھبرا گیا اور دوڑتا ہوا

پکارنے والے کی طرف بڑھا۔ میں نے زور سے کہا "کون ہے بھائی؟"
آواز آئی "میں ہوں جی! — دینو مستری۔ سارا گھر آپ کی فکر میں پریشان ہے۔ آپ بارش میں کدھر نکل گئے تھے؟ — بیماری کی حالت میں!" اور جب وہ میرے قریب آیا تو بولا "یہ چیخا کون تھا ملک جی؟"
میں نے گھبرا کر کہا "میں چیخا تھا۔ ایک کنکر چبھ گیا تھا پاؤں میں۔"
دینو زور سے کھانسا۔ کھانسی مصنوعی تھی۔ میرے دل میں جیسے کسی نے چٹکی لی۔
"کھنڈر میں پناہ لی ہوگی آپ نے؟" اُس نے پوچھا اور میں کانپ اُٹھا۔
بڑی مشکل سے بولا "نہیں نہیں۔ یہیں چلتا پھرتا رہا۔ مجھے ایسے سمے سیر کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔"
"ٹھیک ہے مالک جی!" — اُس کے اندازِ گفتگو میں تصنع تھا۔ میں تیز تیز قدم اُٹھاتا گھر آیا اور بڑی مشکل سے گھر والوں کی تسلی کرائی۔
صبح کو اُٹھ کر میں نے کھنڈر کی راہ لی۔ وہ وہاں موجود تھی، مجھے دیکھ کر شرما گئی۔ مطلع صاف تھا۔ گہرے نیلے آسمان میں سورج کی آتشی ٹکیا پوری آب و تاب سے چمک رہی تھی۔ گاؤں کی چھتوں سے دھواں سا اُٹھ رہا تھا۔ نہائے دھوئے پہاڑ صاف جھیلوں میں اپنے عکس دیکھ رہے

تھے اور خاقی کھنڈر سے اُپلے اُٹھا کر باہر دیوار پہ چُن رہی تھی۔ میں نے اُس کے قریب جاکر کہا "خاقی! میرے خیال میں کل کی رات خواب تھی۔ ـــــ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"

اُس نے لجا کر سر جھکا لیا۔

میں نے فرسودہ اور اکھڑ انداز میں اظہارِ محبت کیا "خاقی! میں تم سے محبّت کرتا ہوں۔"

وہ مسکرائی۔ اُس کے لبوں کے گوشوں میں گہرا طنز تھا۔ بولی "خدا! آپ کا بھلا کرے!"

مجھے اس کے اس جواب سے تسلّی نہ ہوئی اور پھر سوچا کہ آخر میں نے ابھی اظہارِ محبت کے جدید طریقے استعمال نہیں کئے۔ دراصل میرا یہ اظہار اتنا تیز اور رواجی نہیں ہونا چاہئے تھا۔ میں نئے الفاظ کی تلاش کرنے لگا اور گردن کھجاتے ہوئے پلٹ کر گاؤں کی طرف دیکھا۔ دینو مستری کے کوٹھے کی منڈیر پہ ایک بوڑھا مُرغا گردن تان کر پکارا۔ "ککڑوں کوں" ـــــ یعنی تم نے مُنہ کی کھائی ہے۔ میرے دل میں جیسے کسی نے چٹکی لی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک چیل کسی بدبخت مُرغی کا چیختا ہوا چوزہ پنجوں میں جکڑے سُورج پہ سے گزرتی ایک پہاڑی کے تاریک درّے میں گھُس گئی۔

میں چپ چاپ اپنے گھر آ گیا۔

اُس سال کسی خاص مصلحت کی بنا پر میری شادی روک لی گئی۔

دوسرے سال گرما کی رخصتوں میں میں لاہور سے اپنے گاؤں آیا۔ برات دُھوم دھام سے دُلہن کے گھر روانہ ہُوئی۔ میرے شہری دوستوں نے گا گا کر میرے سہرے پڑھے۔ میرے دیہاتی ہمجولیوں نے تالیاں بجا بجا کر ڈھولک کے ارد گرد ناچ ناچ کر اپنی بے لوث مسرت کا ثبوت دیا۔

صبح ہُوئی تو میں شب بیداری کا اثر دُور کرنے کے لئے اکیلا کھیتوں میں نکل گیا۔ اچانک مجھے عقب میں کسی کی چاپ سُنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو اُپلوں والی کھڑی مُسکرا رہی تھی۔

"خاتی!" میں نے حیران ہو کر کہا۔

بولی "آج کس کی شادی ہے جی؟"

میرے دماغ پر بجلی سی آ گری! خون کی جگہ میری رگوں میں خاتی گردش کرنے لگی۔ آسمان میں جیسے ایک شگاف سا پیدا ہو گیا اور میرے سر پہ کئی چٹانیں آ گریں۔ میں تیورا سا گیا!

کچھ دیر کے بعد میں نے سر اُٹھایا تو دینو مستری اپنے کوٹھے پہ کھڑا کھانس رہا تھا اور اُپلوں والی غائب تھی!۔

میں سر جُھکائے واپس ہو پڑا - اپنے گھر کے بڑے دروازے کے قریب سے گزرا تو دُور سے مجھے خُشک اُپلوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر نظر آیا۔

مَیں نے ایک میراثی سے پُوچھا "یہ اُپلے کہاں سے آئے؟"

بولا "کوئی رات کو ڈھیر لگا گیا ہے۔"

دعوتِ ولیمہ کے کھانے تیار کرتے وقت یہی اُپلے جلائے گئے۔

استعفا

اختری کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ ایک بوڑھی خادمہ اور ایک نئی نئی اُستانی، ڈھلتا بڑھاپا اور اُٹھتی جوانی، آگ اور پانی میں اتحاد کیسے ہوتا! بات بات پہ جھڑپ، بڑھیا تنگ آ گئی۔ ایک روز جب اختری نے اسے گندے انڈے لانے پر ذرا سا کوسا۔ تو وہ بولی "لے بی بی! یہ پڑے ہیں تیرے دیگچے دیگچیاں اور یہ پڑے ہیں وہ کپڑے جو تو نے پچھلے مہینے سلا دئیے تھے۔ میں نے اس مہینے کی تنخواہ بھی بخشی، مجھ سے اب یہاں بسر نہ ہو گی، خاک چاٹ کر جی لوں گی، تیرے قورمے زردے نے تو میری زندگی اجیرن کر ڈالی۔"

اور خلافِ معمول اس روز اختری کھِل کھِلا کر ہنس پڑی۔ بڑھیا کو دونوں شانوں سے پکڑ کر دھیرے سے جھنجھوڑا، اور بولی "لے اب رہنے بھی دے بڑی اماں! تھوک دے غصہ۔ تیرے بغیر تو مجھ سے اس شہر میں نہ رہا جائے گا مجھ سے وعدہ لے لے، آج کے بعد اگر تجھے کسی بات پہ ٹوکوں تو میرے کان کتر لینا، میری توبہ!" — اور اختری نے اپنے کان پکڑ لئے۔

بڑھیا کے ماتھے پر شکنوں کی شطرنج بچھ گئی۔ دُھندلی آنکھوں پر پانی کی تہہ سی اُبھر آئی۔ سوچنے لگی، اس اُڑتی پھرتی چنگاری میں یہ حنکی کدھر سے آئی! اور پھر بدگمان سی ہو گئی "جانے اِن میٹھے الفاظ کے پردے میں کیا زہر چھپا ہے۔ اس مخملی دستانے کے نیچے جانے کتنا تیز فولادی پنجہ کلبلا رہا ہے۔ ابھی کوئی گلاس ولاس لڑھک جائے گا مجھ سے اور میری چودہ پشتوں پر برس پڑے گی۔" مذبذب حالت میں کچھ بول نہ سکی، پلٹی اور باورچی خانے کی طرف چل دی۔

مگر اختری تو اس روز ربڑ کا غبارہ بنی پھرتی تھی، کبھی اِدھر مٹک رہی ہے، کبھی اُدھر اُچھل رہی ہے۔ اب یہاں ہے تو پلک جھپکنے میں وہاں تھرک رہی ہے۔ پارے کی طرح تڑپتی اور کوندے کی طرح لپکتی، برآمدے سے باورچی خانے میں، باورچی خانے سے سونے کے کمرے میں۔ اور پھر آنکھوں میں ستارے چمک رہے تھے اور گالوں پہ گلاب کھل رہے تھے۔

بات یہ ہوئی کہ اس کے سامنے کے بالاخانے میں ایک نوجوان کرایہ دار آ بسا۔ اختری یونہی باہر گلی میں جھانک رہی تھی اور وہ تیم واکھڑکی کے پاس الماری میں کتابیں سجا رہا تھا اور دردناک سُروں میں کچھ گنگنا رہا تھا۔

اور جانے کیوں! اختری کے کانوں کی لویں لال پڑ گئیں اور ٹھوڑی کی گولائی لرز اٹھی، لپک کر آئینے کے سامنے آ بیٹھی، بالوں کو سنوارا، قمیص کو کھینچ کھانچ کر جسم سے چمٹا لیا، لپ اسٹک سے ہونٹوں کو آگ لگا دی اور پھر دوڑ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ نوجوان ابھی تک گھوم رہا تھا۔

اور اختری محسوس کرنے لگی جیسے یہ ساری کائنات ایک سونا نگر ہے اور اس نگر کو بسانے کے لئے اس کی ایک نگاہِ ناز، ایک لطیف مس اور ایک مبہم اشارہ ہی بس ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ آج بڑھیا نے اختری کے منہ سے خلافِ معمول اچھے الفاظ سنے تھے اور اس کا دماغ بھنا سا گیا تھا۔

دوسرے روز جب اختری سکول گئی تو لڑکیاں آپس میں سرگوشیاں کرنے لگیں "شاید آج نیا سنگار دان آیا ہے استانی جی کا — "شاید آج استانی جی کو کوئی موہنا سا خواب دکھائی دیا ہے — آج موسلا دھار بارش ہوگی"۔ اختری سر جوڑ کر کھڑی ہوئی لڑکیوں کو دیکھ کر سب کچھ بھانپ گئی۔ جب سے وہ قصبے کے ہائی اسکول میں آئی تھی مٹیالے رنگ کی ایک ساڑی میں ملبوس رہتی، لبوں پہ پھیکی پھیکی مسکراہٹ، آنکھوں میں سناٹے، چہرے پہ چھائیاں اور چال میں سستی، لاہور ایسے شہر کو چھوڑ کر

وہ اس قصبے کو ایک ویران سا محلہ محسوس کرتی تھی۔ یہاں اسے دھندلا سا لیمپ جلانا پڑتا، جس کی روشنی میں اس کی آنکھیں دُکھنے لگتیں۔ میری کوریلی کے ناول پڑھتی رہتی۔ اور جب ایک دو باب ختم کر لیتی، تو پریشان ہو کر اپنے آپ سے پوچھتی "اری کیا پڑھا تُو نے؟ خاک بھی تو پلّے نہیں پڑا، جانے اس معصوم چھوکری کو وہ نوجوان ـــ" بہت دیر تک سوچتی رہتی اور پھر کتاب کو دُور پٹخ کر سونے کی کوشش میں مصروف ہو جاتی لیکن اسے بہت دیر تک نیند نہ آتی اور جب آتی تو سنسان خوابوں کا ہجوم لئے۔ اور پھر اس کی کوئی سہیلی بھی تو نہ تھی، جس سے جی بہلا رہتا۔ اس کے نزدیک اس قصبے کی سب عورتیں دراوڑوں کی اولاد سے تھیں، جنہیں نہ بدن ڈھانکنے کا ڈھب، نہ بات کرنے کا سلیقہ، تیل سے چپڑے ہوئے میلے چیکٹ دوپٹے، کھُلی کھُلی بھونڈی قمیصیں، بات بات پر مردوں سے بھی اُونچے قہقہے! نہ امریکن فلموں کے تذکرے، نہ جمپروں کے نئے ڈیزائن، نہ میری کوریلی کے ناولوں پر بحثیں، بس گھی آٹے کا بھاؤ۔ اور ایک دوسرے کے گِلے۔ صبح صبح وہ سکول جاتی، واپس آتی تو دھم سے پلنگ پر، بڑھیا کو گھرکیاں، کروٹیں اور انگڑائیاں، مٹی کے تیل کی بُو، اور بھینسوں کے گوبر کی سڑاند! وہ تو ان پچھلے دنوں سے استعفا پیش کرنے کا بھی ارادہ کر بیٹھی۔ ابّا کو بھی لکھا، وہ سٹ پٹا کر یہاں دوڑے

آئے، سمجھایا، بجھایا، تسلیاں دیں، بڑے گو بخیلے الفاظ میں آنے والے دنوں کے عفریت کا خوف دلایا، اور پھر یہ بھی کہا کہ "سجاد اب کے ایم۔ اے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا، اور پھر ——!"

"پھر کیا؟" اختری نے سوچا "وہ پشاور میں ہوں گے، تو میں بکودر میں ہوں گی، وہ میرٹھ جائیں گے تو میں قصور میں پڑی سڑتی رہوں گی" لیکن اس نے ابا کے کہنے پر استعفا دینے کا خیال دل سے نکال دیا۔ آج سے دو چار دن پہلے وہ پھر اسی معاملے پر غور کر رہی تھی کہ اچانک اس کی تقدیر نے پلٹا کھایا، اور مقابل کے بالاخانے کی کھڑکی آباد ہو گئی۔

مسکراتی ہوئی لڑکیوں کو مخاطب کرتے ہوئے وہ بولی: "آج تم سب کے لبوں پر تبسم کیوں کھیل رہے ہیں؟ نویں جماعت کی لڑکیوں کو اپنی استانی کے سامنے ایسے اکھڑپنے کا اظہار نہیں کرنا چاہیے" —— لیکن لڑکیاں بدستور مسکراتی رہیں، اور ایک نے تو جرأت کر کے یہ بھی پوچھ لیا۔

"استانی جی! وہ نیلے رنگ والی ساڑی کیا کی آپ نے؟"

اور اختری مسکرا کر بولی: "اچھا یہ بات ہے، لیکن وہ دیکھو، بہرا نے نئی قمیص پہن رکھی ہے، اور راحا رانی کا دوپٹہ آج خلاف معمول اجلا اجلا ہے، اور وہ رشیدہ کے کانوں میں نئے جھمکے! میں نے کوئی نئی بات نہیں کی۔"

لیکن لڑکیاں محسوس کر رہی تھیں کہ یہ بالکل نئی بات ہے جو اپنے اس نئے نئے راز کو یوں فاش ہوتا دیکھ کر وہ بہت گھبرائی۔ لڑکیوں کو بے چوں چرا جھڑکا، اور جب گھر واپس آئی تو بڑھیا کو اپنے چولے سے جوئیں نکالتے دیکھ کر آگ بگولا ہو کر رہ گئی۔ بولی "کیا انہی ہاتھوں سے مجھے کھانا وغیرہ ـــــ" اور سامنے کی کھڑکی میں اسے ایک سایہ نظر آگیا۔

بڑھیا اختری کے تیور جانچ کر بولی "لیکن بی بی! کھانا پکانے سے پہلے ہاتھ دھو لیتی ہوں میں۔"

اختری نہیں چاہتی تھی کہ اس وقت کوئی اس کے تصورات کی ہولے ہولے بہتی ہوئی ندی میں کنکر پھینک دے۔ بڑھیا کو خاموش رکھنے کے لیے وہ مسکرائی اور بولی "میں نے کب کہا ہے کہ تو ہاتھ صاف نہیں کرتی، تیری ایسی ستھری اور سگھڑ بڑھیا تو مغل شہزادیوں کو بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی۔" اور بڑھیا خوش ہو کر یوں ہنسی، جیسے کوئی تیز رفتار گھوڑا کنکروں پر دوڑا جا رہا ہو۔

سامنے کھڑکی سے دھوئیں کی پتلی پتلی دھاریاں لہراتی ہوئی نکل رہی تھیں اور ان دھاریوں پر بہت دلآویز اور دردناک سی گنگناہٹ تیرتی آ رہی تھی۔ اختری کھڑکی کے پاس جا کر بہت دیر تک کھڑی رہی اور انتظار کرتی رہی کہ اس تصویر میں یہ پُراسرار مصوّر کوئی نیا رنگ بھرے گا، مگر

دھواں اسی طرح اُڑتا رہا۔ گنگناہٹ اسی طرح تیرتی رہی۔ صرف سورج کے مغربی اُفق تک پہنچ جانے کی وجہ سے یہ منظر دُھندلا سا گیا۔ پلٹ کر وہ دروازے کے پاس گئی اور بڑھیا کو چائے لانے کے لئے کہا۔ حیران بڑھیا باورچی خانے سے نکل کر بولی ”بی بی! چائے تو کب کی تپائی پر رکھ آئی ہوں میں۔“

”اچھا“ اختری مسکرائی، اور تپائی کے قریب آکر چائے کی طرف دیکھا، تو زور زور سے ہنسنے لگی، اور بولی ”گرم چیزیں دیر تک ایک جگہ پڑی رہنے سے سرد ہو جاتی ہیں۔ بڑی اماں اُٹھا لے جا طشت کو اور اس چائے کو پھر گرم نہ کرنا، بدذائقہ ہو جائے گی۔“

بڑھیا چائے اُٹھا کر لے گئی تو اختری سوچنے لگی کہ یہ عجیب نوجوان ہے جو نہ کہیں باہر سیر کو جاتا ہے، نہ اپنے کمرے ہی میں ٹہلنے کی تکلیف گوارا کرتا ہے۔ کھڑکی میں سے بھی نہیں جھانکتا، سگریٹ سلگا کر بے مزہ اشعار گنگناتا رہتا ہے اور دیر تک گنگناتا رہا ہے۔ لیکن اُس کے یہاں آنے سے قبل میرا بھی تو یہی معمول تھا۔ اِن دنوں میری کوئی سہیلی نہ تھی، کوئی ہمجولی نہ تھا، اکیلی تھی میں۔ لیکن اب جب میں چاہتی ہوں کہ وہ میرا دوست ہو جائے، میرے دل کو اس آرزو سے ہی تشفی مل رہی ہے۔ شاید یہ بھی اکیلا ہے، اسے بھی اس منحوس قصبے میں اپنا کوئی ہم خیال نہیں ملتا اور

اسی لئے اس اندھیرے بالاخانے میں پڑا سڑ رہا ہے۔ اب اسے کون بتلائے کہ تیرے بالاخانے کی مقابل کی کھڑکی میں تجھے اپنی ہم خیال اور ہم مذاق دوست مل جائے گی، لیکن وہ کھڑکی سے باہر دیکھے بھی تو، وہ تو کسی دیوار کی اوٹ میں بیٹھا جانے اب پڑھ رہا ہے یا سو رہا ہے یا سوچ رہا ہے۔ اب گنگناہٹ بند ہو چکی تھی۔ رات کی وجہ سے دھواں بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اور ہنوز وہ کمرہ اسی طرح تاریک تھا۔

کھانا کھا کر اختری پھر کھڑکی کے پاس آ بیٹھی۔ ایک بار سامنے ایک دیا سلائی روشن ہوئی اور ایک مدھم سی روشنی پھیل گئی۔ شاید موم بتی جلائی تھی اس نے، یا کوئی گھٹیا قسم کی لالٹین۔ اور اس کے بعد وہی گنگناہٹ شروع ہو گئی۔ بہت رات گئے تک اختری وہیں بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھیں دکھنے لگیں، کان بجنے لگے اور کل سے دل کی کونپل پہ جو کلیاں سی کھلنے لگی تھیں وہ جیسے کملا کر نیچے لٹکنے لگیں۔ پلٹی اور دھم سے پلنگ پہ جا گری، بہت دیر تک سوچتی رہی کہ یہ عجیب پُراسرار نوجوان ہے جو اپنے آپ کو اس اندھیری چار دیواری میں اس شدت سے جکڑے ہوئے ہے۔ خدا جانے اس کے خیالات کیا ہیں؟ جذبات کیا ہیں؟ اس کی افتادِ طبع کیسی ہے، کیا شغل ہے اس کا! یہ تو میرے لئے الف لیلہ کا کوئی کردار بنتا چلا جا رہا ہے اور میں کتنی بے وقوف ہوں۔

کہ ایک مبہم سے خیال کے زیر اثر اتنی دیر تک جاگتی رہی اور آج سکول میں
خواہ مخواہ لڑکیوں کے استہزا کا نشانہ بنی۔ چائے بھی تو نہ پی جس کے بغیر
میں اپنے آپ کو برف کا تودا سمجھنے لگتی تھی۔ کوئی کام بھی تو نہ کیا اور
وہ میری کوریلی کے ناول میں اس مغموم لڑکی کو جاننے وہ نوجوان ——
وہ اُٹھی، ناول کھولا اور ایک صفحہ کی تلاش میں تھی کہ اسے نوجوان کی
گنگناہٹ بلند ہوتی سُنائی دی۔ پلنگ سے کھسک کر وہ کھڑکی کے
قریب پہنچ گئی، لیکن نہ جانے کیوں اب وہ اپنے آپ کو اس پر ظاہر
نہیں کرنا چاہتی تھی، ایک طرف دبکی کھڑی رہی اور وہ نوجوان کھڑکی سے
باہر سر نکالے ایک شعر گاتا رہا۔

اختری نے کئی بار ارادہ کیا کہ ہمت کرکے کھڑکی کے مقابل آجائے
لیمپ کی روشنی تو کسی حالت میں اس کے چہرے پہ نہ پڑ سکے گی اور
پھر اس نوجوان کا چہرہ بھی تو نظر نہیں آتا۔ اس کھڑکی میں بھی ایک سایہ
اس کھڑکی میں بھی ایک سایہ۔ ایک دوسرے کے سائے دیکھ کر شاید
—— شاید —— شاید کیا! اس کے دل میں چند 'ناپاک' خیالات آئے۔
ناپاک اس لئے کہ دسویں جماعت میں پڑھی ہوئی ایک مذہبی کتاب کے
نقطہء نظر سے اس قسم کے خیالات کنواری لڑکیوں کو زیب نہیں دیتے تھے
اور ابھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ نوجوان پیچھے ہٹ گیا اور اختری کھڑکی کے

مقابل دیر تک کھڑے رہنے کے بعد پھر اسی طرح پلنگ پر آگری۔
اُس نے اپنے دل میں چمکتی ہوئی چنگاریوں پر راکھ ڈال کر انہیں بجھانے یا کم از کم چھپانے کی بہت کوشش کی مگر وہ پھر سطح پر اُبھر آئیں اور وہ کروٹیں بدل بدل کر اپنے شانے چھیلتی رہی۔ نیند آئی تو اچھی سنسان خوابوں کو ساتھ لیئے، اور جب صُبح ہوئی تو کھڑکی سے اسی طرح دھواں اور دھوئیں کے ساتھ گنگناہٹ باہر تیرے جا رہی تھی۔ اور یہ دھوئیں اور گنگناہٹیں پیدا کرنے والا نظر نہ آتا تھا۔
یُوں تو گذر نہ ہوگی۔ اُس نے سوچا۔ جرأت کرنی چاہیئے، لیکن ایک کنواری لڑکی ہوتے ہوئے یہ جُرأت کرنے کا خیال ایک خواب سا بن جاتا۔ وہ چاہتی کہ یُونہی آپ ہی آپ بغیر کسی قسم کے تردّد کے وہ ادھر توجہ کرنے لگے تو ذرا یہ دن اچھے گذر جائیں گے۔ شہری معلوم ہوتا ہے اور پھر پڑوسی بھی ہیے۔ سکول سے بعد اکٹھے چائے پی لی۔ یا ادب کے متعلق دو چار باتیں کر لیں۔ بس۔ ہیں اور کیا چاہتی ہوں۔ کچھ نہیں۔ بس ذرا وقت اچھا کٹ جائے گا، اس کا بھی اور میرا بھی۔ اور میرا کیا ہے، میں تو تین مہینے پہلے ہی جیتی چلی آئی۔ یہ بے چارہ یہاں جانے پڑ جائے گا، اس کا اپنا بھلا ہے اس بات میں۔
اچانک اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ نوجوان سامنے کھڑکی

میں سے باہر جھانک رہا تھا۔ لمبے لمبے پریشان بال، بڑی بڑی اُداس
آنکھیں، باوقار لیکن پژمردہ چہرہ وہ اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور جب سیدھا ہوا
تو اچانک اس کی نظریں اختری پر پڑیں جو اس کے بالکل مقابل بالوں
میں کنگھی کر رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے وہ سُن ہو کر رہ گیا، رنگ فق ہو گیا
اور آنکھوں پر گھنی بھویں جھک آئیں۔ اختری کو اپنی طرف متوجہ پاکر وہ
نیچے دیکھنے لگا اور پھر گھوم کر ایک طرف ہو گیا اور اختری نے آج پھر
سنگار دان کو ایک گھنٹہ تک استعمال کیا اور یوں بن ٹھن کر نکلی کہ سکول
کی لڑکیاں اسے دیکھ کر دم بخود سی رہ گئیں۔ دن بھر وہ لڑکیوں کو لطیفے
سناتی رہی اور پھر میری کوریلی کے ایک ناول کا پلاٹ بھی سُنایا۔ اور پھر
جب وہ اس معصوم لڑکی کی باتیں کر رہی تھی جسے وہ نوجوان —! تو وہ
اچانک رُک گئی اور لڑکیوں نے ایک زبان ہو کر پُوچھا۔ "آگے اختری جی؟"

"بس میں نے یہیں تک پڑھا ہے۔" اس نے گھبرا کر جواب دیا۔ اور
لڑکیاں اُداس سی ہو گئیں۔ جانے وہ نوجوان — بر نشتر ان کے دلوں میں
چبھنے لگا اور جب اختری گھر واپس آئی تو یہی سوچ رہی تھی کہ جانے وہ نوجوان
— خُدا جانے! کوئی اپنی تقدیر کو کیا سمجھے۔ مستقبل کے متعلق سوچنا تو بیکاروں
کا مشغلہ ہے، کیونکہ سوچ سوچ کر ناحق جی ہلکان ہوتا رہتا ہے اور پھر
ہوتا وہی ہے جو مقدر میں لکھا ہے، لیکن جانے —!

بڑھیا کی خوشامد کرتی وہ اپنے کمرے میں آئی۔ دیر تک لباس نہ بدلا۔ شاید وہ نوجوان کھڑکی سے جھانکے۔ لیکن بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد وہ مایوس سی ہو گئی۔ نیا لباس اتار دیا اور میلی ساڑھی پہن لی اور جونہی میلی ساڑھی پہن چکی تو وہ سامنے کھڑکی میں نمودار ہوا۔ اختری نے یوں محسوس کیا جیسے اُس کے ہاتھوں میں سے چینی کے برتنوں کا طشت چھوٹ کر فرش پر گر گیا ہے۔ سنگین بت کی طرح وہیں جم گئی۔ نوجوان کی نظریں سیدھی اس پر پڑیں اور انھوں نے اختری کا کچھ اس انداز سے جائزہ لیا، جیسے وہ بیوٹی کمپیٹیشن کا سب سے بڑا جج ہے اور اختری یوں ساکت و صامت کھڑی رہی جیسے آج ہی اُس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے گھبرائے ہوئے نیچے فرش پر نظریں جمائے رکھیں، شانوں پر پڑے ہوئے بالوں کو سر کے ایک جھٹکے سے پیچھے کیا اور سامنے دیکھا تو نوجوان کھڑکی سے ہٹ چکا تھا۔ اسے اپنے آپ پر بہت غصہ آیا۔ ایک غیر مرد کے سامنے بیگموں کی طرح اپنے حسن کی نمائش کرنے کے لئے کھڑی رہی اور وہ غیر مرد اتنا بے نیاز! اتنا بد مذاق کہ اُس نے توجہ ہی نہ کی۔ اختری نے محسوس کیا جیسے وہ اس گھناؤنی صورت والی گداگر چھوکری سے بھی زیادہ ذلیل ہے، جو روزانہ نیچے گلی میں قدم قدم پر کوڑھ کے کیڑے گراتی گزر جاتی ہے۔

اس نے جی ہی جی میں فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اُس طرف کبھی نہ دیکھے گی۔ کھڑکی بند کر دیتی، لیکن روشنی اور ہوا کا ایک ہی تو راستہ تھا بس وہ اُدھر دیکھے گی نہیں یہیں پلنگ پر لیٹی ناول پڑھتی رہے گی، لاہور کی سہیلیوں کو خط لکھتی رہے گی، سجاد صاحب کے متعلق سوچتی رہے گی، بہرحال وہ اُدھر توجہ نہ کرے گی۔

اور یہ تہیہ کر کے وہ باورچی خانے میں گئی۔ بڑھیا کے پاس بیٹھ کر چائے پی اور دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی۔ پھر اپنے کمرے میں آ کر لیمپ روشن کیا نظریں جھکائے پلنگ تک آئی اور خدا جانے کس طرح اُس کی نظریں کھڑکی پہ جا پڑیں۔ کھڑکی ہوا کے جھونکے سے بند ہو چکی تھی۔ یہ اچھا ہوا، اس نے سوچا۔ ورنہ میں تو اپنے فیصلے سے انحراف کر چکی تھی، لیکن آدھ گھنٹے کے بعد اسے ہوا کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جا کر کھڑکی کھولی تو وہ نوجوان باہر گلی میں جھانک رہا تھا۔ کھڑکی کھلنے کی آواز سُنی تو وہ پیچھے ہٹ کر ایک طرف گھوم گیا!

اور اختری سوچنے لگی کہ شاید یہ نوجوان شرماتا ہے اور ڈرتا ہے کہ اگر میری طرف توجہ کر بیٹھا تو میں کہیں ہنگامہ نہ مچا دوں لیکن مجھے تو وہ اچھا سیانا دکھائی دیتا ہے کیا اُس نے میری آنکھوں کی چمک اور میرے عارض کے رنگ نہیں دیکھے! کیا وہ سمجھتا ہے کہ میں کھڑکی کے پاس صرف ہوا خوری کے لیئے آ کھڑی ہوتی ہوں! بیچارا کتنی غلطی پہ ہے۔ اسے سمجھایا جائے لیکن کس طریقے سے! اب میں کیسے اسے آواز دوں اور جب وہ کھڑکی میں آئے تو

کیسے کہوں کہ تم ناحق ہچکچا رہے ہو۔ تم تو میرے — ! مرچوں کے اس بڑھتے ہوئے وحلا رے کے سامنے اچانک کسی احساس نے بند باندھ دیا۔ آکر پلنگ پر گر پڑی، اور روشنیوں اور تاریکیوں کو آپس میں گھلتے ملتے دیکھتی رہی، یُوں نہیں۔ یُوں۔ یُوں بھی نہیں، یوں۔ نہیں نہیں، یُوں بھی ٹھیک نہیں۔ یُوں!

لیکن وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچی۔ اور صبح اُٹھ کر جب وہ لباس بدل رہی تھی تو اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال اُبھرا۔ وقت سے بہت پہلے سکول پہنچی۔ سکول کی پرانی ملازمہ کو بلا کر ایک طرف لے گئی اور بولی۔ "میں جب سے اس سکول میں آئی ہوں مجھے بڑی اماں تمہارے سوا کسی سے دلچسپی نہیں۔ تمہاری میٹھی میٹھی باتیں اور تمہاری بزرگی اور تمہاری مہربان صورت — میں تو اس بھرے شہر میں صرف تمہیں کو اپنا سمجھتی ہوں ورنہ یہ خشک اُستانیاں اور یہ گستاخ چھوکریاں — ان سے تو میرا جی بیزار ہو چکا ہے۔ تم اتنی اچھی ہو بڑی اماں کہ —"

اور بڑھیا مسرت سے ہانپتی ہوئی بولی "لیکن بیٹی تو نے مجھے کبھی کوئی خدمت بھی تو نہیں بتائی۔ میری بزرگی اور میری باتیں تمہارے کس کام کی تمہارے یہاں آنے سے پہلے یہاں ایک اُستانی آئی تھیں —"

اختری گھبرا گئی۔ اب بڑھیا ایک ایسے قصے کو چھیڑنے والی تھی جو

شام تک بھی شاید ہی ختم ہوتا۔ جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر بولی۔
"بڑی اماں! اتنا بڑا کام ہیں تمھارے سوا اور کسی کے سپرد نہ کرتی۔ یہ لو
اپنا انعام اور شام کو میرے پاس آئیو۔ میں تمھیں ایک خط لکھ دوں گی اور
وہ ـــ" اختری کا سارا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ ہونٹ کانپنے لگے
اور کچھ کہنے کی کوشش اور کچھ کہہ نہ سکنے کے دُکھ سے اس کا رنگ اُڑ گیا۔
بڑھیا مسکرا کر بولی "لے بی بی۔ مجھ سے پردا کیا۔ بتاؤ کون ہے؟ بس یہ
سمجھو، میرے سر پر سلیمانی ٹوپی ہے، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ میں آج تک بھو
نہیں چھانتی پھری۔ یہاں سب نئی نئی آشنائیوں کے رُقعے ـــ"
اور اختری کل کی طرح بول اُٹھی: "وہ میرے گھر کے مقابل ایک پرانا سا
بالاخانہ ہے نا، وہاں ایک نوجوان رہتے ہیں، انھیں دے آئیو۔"
"اچھا وہ شفیق!" بڑھیا ہنسی۔
شفیق! اور بڑھیا اسے جانتی بھی ہے، حیران بھی ہوئی، خوش بھی ہوئی
اپنے آپ کو ہلکا پھلکا بھی محسوس کرنے لگی۔ اسکول کے چند گھنٹے اس کے
سینہ پر کابوس کی طرح سوار رہے۔ آخری گھنٹی بجی تو لپک کر گھر آئی۔ بہت
سے خط لکھے اور پھاڑ کر پھینک دئے اور آخر وہ صرف یہ دو سطریں ہی لکھ سکی۔

حضرت!

پڑوسیوں کے ایک دوسرے پر جو حقوق ہوتے ہیں، ان سے تو آپ

ناواقف نہیں ہوں گے۔ آج رات کا کھانا میرے ہاں تناول فرمائیے گا۔

اختری

خط لکھ چکی تو سکول کی بوڑھی ملازمہ آپہنچی۔ اسے لفافہ دیا اور پھر کھڑکی کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ دل یوں دھڑکنے لگا جیسے اسے کسی نجومی نے زلزلے کی اطلاع دے دی ہے اور وہ کائنات کے گردش بدلنے کی منتظر ہے۔ جسم تپ گیا، آنکھوں کے ڈوروں میں جلن سی ہونے لگی۔ سامنے کھڑکی سے اسے بڑھیا کے سلیپر گھسٹنے کی آواز آئی۔ دس بارہ منٹ تک خاموشی رہی۔ اور پھر سلیپروں کی آواز آئی۔ وہ تیزی سے پلنگ پر بیٹھ کر میری کوریلی کا ناول پڑھنے لگی اور جب اس معصوم لڑکی نے اس نوجوان کو ـــ ! بڑھیا نے اسی کا لفافہ سامنے میز پر رکھ دیا۔

"جواب ہی نہیں دیا؟" اختری نے پوچھا۔

او۔ بڑھیا بولی "ری بی بی! تو اتنا گھبرا کیوں رہی ہے، تیرے خط کے پیچھے ہی کچھ لکھ دیا ہے اس نے۔ لفافہ تو کھول۔"

اختری نے لفافہ کھولا۔ آنکھوں کے سامنے ایک بحرِ زخار سا لہریں لینے لگا اور پھر ان اچھلتی اور لپکتی ہوئی لہروں میں سے یہ دو سطریں ابھریں:

محترمہ!

میں دودھ کا جلا ہوں اور اب چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیتا

کے بجائے اسے چھوتا تک نہیں۔ شکریہ!

شفیق

اختری خط پڑھ چکی تو بڑھیا کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی "کل پھر کس وقت ہے، مبارک ہو بی بی! شفیق بڑا اچھا چھوکرا ہے، میں اس کی پرانی خدمت گار ہوں۔"

بڑھیا چلی گئی تو اختری بہت دیر تک سامنے دیوار پر نظریں گاڑے بُت کی طرح بیٹھی رہی اور پھر اچانک بگولے کی طرح اُبھر کر ایک کاغذ کھینچا اور اس پر کچھ لکھنا ہی چاہتی تھی کہ سامنے بالاخانے کی کھڑکی کھڑاک سے بند ہونے کی آواز آئی۔ وہ لپک کر کھڑکی تک گئی۔ نیچے گلی میں جھانکا تو وہی نوجوان ہاتھ میں بستر لٹکائے اور کاندھے پر ایک بکس دھرے سیڑھیاں اُترا اور پھر ہولے ہولے چلتا ایک اور گلی میں مڑ گیا۔ اختری نے یوں محسوس کیا جیسے کسی نے اسے بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھا لیا ہے۔ دیوانوں کی طرح قلم کی تلاش میں سارا کمرہ چھان مارا اور آخر اسے قلم اپنے ہاتھ ہی میں مل گیا۔ میز پہ جھک گئی۔ کچھ لکھا، بڑھیا کو آواز دی، وہ بھاگی بھاگی آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک خط دیتے ہوئے بولی "یہ جا کر ڈاک خانے ڈال آ، جلدی۔"

"گھر بھیج رہی ہو بی بی!" بڑھیا نے پوچھا "میرے سلام لکھ دیے ہیں، بڑی بی بی جی کو؟"

"یہ میرا استعفا ہے۔" اختری بولی

"استعفا۔ بی بی!" بڑھیا کی دھندلی آنکھیں پھیل گئیں۔ "کیوں؟"

"میں یہاں لڑکیوں کو پڑھانے اور سکھانے آئی تھی۔" اختری بولی۔ "لیکن مجھے ابھی خود ہی بہت کچھ پڑھنا اور سیکھنا ہے۔ خدا را آؤ اور پھر اگر اس کھڑکی کو بند کر کے اس میں کیلیں ٹھونک دو کہ پھر کھل نہ سکے۔ میں آج کل تازہ ہوا سے گھبراتی ہوں۔" اور اس نے میری کوریلی کا ناول اٹھا لیا!

(اردو پریس ۸۸ میکلوڈ روڈ۔ لاہور)

(محمد اقبال جاسی خوش نویس)